ق ع

سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

المعارف

حصہ اول

مشتمل

مقالات و ارشادات مولانا محمد عبد القدیر صاحب صدیقی قادری حیدرآبادی

مجمّعہ

احمد منیر الدین صاحب فاروقی قادری قاضی پربھنی

باہتمام

محمد مظہر الدین صدیقی قادری متوطن پربھنی

شمس الاسلام پریس سے نور افشان معارف الٰہیہ ہوا

قیمت (۸ر)

حامداً و مصلیاً

علم کی فضیلت معلوم کی فضیلت سے ہوتی ہے اور میرا معلوم سب سے اعلیٰ
ب سے افضل ہے تو اس کے متعلق بھی جو علم ہوگا وہ سب علوم سے اعلیٰ و افضل
ی ہوگا۔ میں کس کی ذات و صفات و اسماء و افعال سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں؟
لله کی۔ اللہ میرا محبوب ہے اس کا ذکر مجھے مرغوب ہے۔ جو میرے دل و دماغ
یں ہے وہ زبان و قلم سے نکلیگا۔ دوسروں کو لطف آئے یا نہ آئے مجھے تو
لذت مل رہی ہے۔ کوئی اس کو دیکھے نہ دیکھے میں خود اس کو بار بار دیکھونگا۔
ور اپنا سبق دہراؤنگا۔

من خلیلِ وقتم و لذت کشِ خوانِ خودم   از ضیافت ہائے طبعِ خویش مہمانِ خودم
نیست پروا نغمہ ام کس بشنود یا نشنود   ہمچو طاؤسِ چمن رقصاں بر افغانِ خودم

(فہیم قاضی پربھنی)

تیری سنا کریں گے، تیری کہا کریں گے   مندر میں اپنے دل کے پوجا کریں گے تجھکو
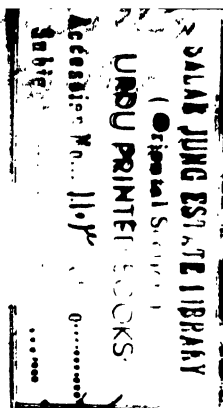
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نغمۂ محبّت

ارے یہ کیا ہو رہا ہے؟ کوئی گدگدی کر رہا ہے۔ اوہ! کوئی چیز دل میں کھٹک رہی ہے۔ اُفوہ! کلیجہ منہ کو آرہا ہے۔ آہ! آہ! تن بدن میں آگ لگ رہی ہے۔ کوئی شئے سر سے پاؤں تک دوڑ رہی ہے۔ اَلْعِیَاذُ بِاللہ آنکھوں سے دکھائی دیتا ہے، نہ کانوں سے سنائی دیتا ہے۔ اللہُ اکبر! یہ کیا شور ہے؟ یہ کس کا زور ہے؟ مجھے کوئی گھسیٹے لئے جا رہا ہے۔ کدھر، کدھر؟ اُدھر، اُدھر۔ تو کون ہے؟ میں مستی ہوں، دشمنِ خود پرستی ہوں۔ ذوق سے معمور ہوں، نشہ میں چور ہوں، عقل سے دور ہوں، سراپا سرور ہوں۔ سحر میری چشمِ فتاں میں، آشوب میرے کاکلِ پیچاں میں۔ اعجاز میری زباں میں۔ محویت میرے روئے تاباں میں۔ فتنہ میرے اشاروں میں۔ قیامت میری ٹھوکروں میں۔ ادا کی تلوار۔

نازکا خنجر۔ نگہ کی بندوق چلانا۔ چلتے چلتے آگ لگانا میرا ایک تماشہ ہے۔
ہنستے ہنستے بجلیاں گرانا، میرا ایک کرشمہ ہے۔ آخر! تو کون ہے؟
میرا ہر جگہ جدا نام ہے، جدا کام ہے۔ ذرّاتِ عالم میں کششِ اتصال ہوں
زمین اور زمینیات میں کششِ ثقل۔ مختلف مادّوں میں کششِ کیمیاوی۔ کُرات
عالم میں تجاذب۔ جانوروں میں مُوالفت۔ بچوں میں شوقِ بازی۔ جوانوں
میں حُسن پرستی۔ بوڑھوں میں شفقت۔ غرباء میں حسرت۔ اغنیاء میں حرصِ دولت
سپاہیوں میں شہامت۔ امراء میں جاہ و عزّت۔ علماء میں وقار و متانت
بادشاہوں میں عظمت۔ اہلِ مذہب میں حمیّت۔ اہلِ ملک میں عصبیّت۔
صالحین میں عبادت۔ سالکین میں توحیدِ عزیمت۔ واصلین میں بےخودی
کاملین میں بندگی۔

تجھے خدا کی قسم! سچ کہنا تو کون ہے۔ اور تیرا نام کیا ہے؟
اِمتیاز کا مٹانا۔ اتحاد کا پیدا کرنا۔ بچھڑوں کو ملانا۔ دو کو ایک کرنا
میرا کام ہے۔ "محبّت" میرا نام ہے۔ تیرا مقام؟ ذرۂ بےمقدار سے
خورشیدِ پُرانوار تک میرا جولانگاہ ہے۔ آخر تیری آرامگاہ؟ دلِ شکستہ و دماغِ
آشفتہ۔ کیا کھاتی؟ کیا پیتی ہے؟ عاشقوں کا خونِ دل پیتی ہوں اور

تحتِ جگر کھاتی ہوں۔ تیرا انتساب؟ ماورائے الحجاب۔ تیرا سن وسال؟
ظہورِ عالم سے ایک سال زیادہ ہوں، مگر ہنوز تر و تازہ ہوں۔ جوانی میری
دیوانی ہے۔ شباب مجھ پر خراب ہے۔ تیری عنایت، محبت کی غایت؟
کہیں اقتضائے طبیعت۔ کہیں نفع یا لذت۔ اہلِ صلاح میں خیر و فلاح۔
اہلِ معرفت میں علتِ فطرت میں قربان۔ محبت کا نشان؟ نامۂ محبوب
کا فریفتہ۔ پیغامبر کا دلدادہ، ہر کام میں مطیعِ احکام، ہر امر میں ایثار، ہر بات
میں فرمانبردار، بندگی میں سر افگندگی، ذلت میں لذت۔ یاد میں شاد۔
سراپا خیال۔ ہمہ تن محال۔ زمین پر مکان، نہ آسمان پر نشان۔ خانہ برباد۔
ناشاد، نامراد۔ تیرے طالب کیسے ہوتے ہیں؟ ہوس کار، برقع کے
نقش و نگار پر گرفتار۔ کم فہم، برقع میں سے چھننے والے انوار پر بے قرار۔
جو سچا طالبِ دیدار ہوتا ہے، وہ جان نثار ہوتا ہے۔ منع کرتی ہوں سمجھاتی
ہوں۔ اصرار کرتا ہے۔ نہیں مانتا، تو اس کو وادیٔ حیرت میں لیجاتی ہوں
شرابِ بےخودی، صہبائے خود فراموشی پلاتی ہوں، پھر اپنے منہ پر سے
نقاب اٹھاتی ہوں، آئینہ بنکر سامنے کھڑی ہو جاتی ہوں۔ دیوانہ ہاتھ
پھیلاتا ہے کہ مجھ سے بغل گیر ہو۔ ہاتھ خالی جاتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو

پکڑ لیتا ہے۔ ہوش آتا ہے تو کچھ یاد ہے، کچھ فراموش ہے۔ غربت خاموش ہے۔ جہل میں علم ہے ظلمت میں نور ہے۔ مرآتِ حیرت ہے۔ لوگ اسے چھیڑتے ہیں۔ سبب پوچھتے ہیں۔ بے چارہ اپنی زبان بھول جاتا ہے۔ ہندیوں سے عربی بولتا ہے، وہ بھی عاد و جُرہُم کی۔ پھر کہنا کچھ چاہتا ہے منہ سے کچھ نکلتا ہے۔ لوگ اِس پر ہنستے ہیں، وہ لوگوں پر ہنستا ہے۔ جہلاء اِس کو مجنون سمجھتے ہیں۔ علماء اپنے محاورے کے مطابق اِس کے کلام کا مطلب نکالتے ہیں۔ من مانے حکم لگاتے ہیں۔ ان عاشقوں میں جو دقیقہ سنج ہوتے ہیں، مرنجاں مرنج ہوتے ہیں۔ یہ آسمانی زبان میں کلام کرتے ہیں۔ سامعین کے فہم میں جو کچھ آتا ہے، مان لیتے ہیں۔ نہیں سمجھ میں آتا تو تاویل کر لیتے ہیں۔ لوگ ان کے نشانِ قدم پر چلتے ہیں۔ اِن کے خاکِ قدم کو کحل البصیرت سمجھتے ہیں۔

میں کون ہوں اور کیا ہوں؟.....

میں کون ہوں؟ میں، میں ہوں۔ تو کیا میں محمد عبدالقدیر نہیں ہوں؟ کس نے کہا کہ نہیں ہو۔ بات یہ ہے کہ جتنے الفاظ

استعمال کئے جاتے ہیں، وہ مقابل کے لحاظ سے ہیں۔ صرف ایک لفظ "میں" ہے کہ وہ کسی کے مقابل نہیں ہے۔

مولوی محمد الیاس برنی صاحب کے لحاظ سے دیکھو تو محمد عبد القدیر ہوں۔ وہ الیاس ہیں تو میں حسرت ہوں۔ وہ فاروقی ہیں تو میں صدیقی ہوں۔ وہ بلند شہری ہیں، تو میں، حیدرآبادی ہوں وہ جوان ہیں تو میں کہل ہوں۔ وہ ناظم دار الترجمہ ہیں، تو، میں، وظیفہ یاب صدر شعبۂ دینیات ہوں۔ باوجودیکہ ہم دونوں باہم دوست ہیں۔ جامعۂ عثمانیہ کے متعلقین سے ہیں۔ ہم مذہب ہیں، ہم مشرب ہیں۔ ہم خیال ہیں۔ اور یہ چند امور کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ مگر کتنے جواب بدلکر دیئے گئے۔

اب کسی جانور سے مقابلہ کرو تو انسان ہوں۔ درخت سے مقابلہ کرو تو حیاتِ ظاہری رکھتا ہوں، حساس ہوں۔ پتھر سے مقابلہ کرو تو نامی ہوں۔ نشو و نما پاتا ہوں۔ فرشتے کے مقابل جسم ہوں۔ رنگ و بو کے مقابل جوہر ہوں، واجب سے نسبت دو، تو ممکن ہوں، رب کی طرف اضافت کرو، تو عبد ہوں، میں سلطنتِ بدن کا سلطان ہوں۔ دل میرا

تختِ سلطنت ہے، دماغ میری کرسیِ حکومت ہے حِسِّ مشترک میرا دارالمطالعہ۔ حافظہ کتب خانہ ہے۔ خیال سیرگاہ ہے متخیلہ شکارگاہ۔ اعضاء میری رعایا ہیں۔ عقل میرا صدرِ اعظم ہے۔ غضب صدرالمہامِ افواج ہے۔ زبان صدرالمہامِ سیاسیات ہے۔ ضمیر صدرالمہامِ عدالت ہے۔ معدہ صدرالمہامِ مالگزاری ہے۔ جگر صدرالمہامِ فینانس ہے۔ علم مہتمم روشنی و برقیات ہے۔ اعصاب منتظم تاربرقی و ٹیلیفون ہیں۔

تقویٰ میرا لباس ہے۔ عفت میرا ازار ہے۔ ایمان میرا تاج ہے صدق میرا کمربند ہے۔ حمیت میری تلوار ہے، صبر میری سپر ہے۔ توکل میرا عصا ہے۔ ہمت میری بندوق ہے۔ محبت میری شراب ہے۔ اطمینان میری مسہری ہے، جس میں لیٹتا اور آرام لیتا ہوں۔ کیا سلطنت اور کیا سلطان؟ میں مرقاۃِ مَن عرف ہوں میں تصویرِ رحمٰن ہوں۔ قلب میرا عرش ہے، دماغ میری کرسی ہے۔ حافظہ لوحِ محفوظ ہے۔ خیال مثال و حواس ملائکہ ہیں۔ اعصاب سمٰوات ہیں۔ قویٰ طبائع ہیں۔ اعضاء عناصر ہیں۔ حیات مجھ میں ہے۔ علم میرا مایۂ الامتیاز ہے۔ سمع و بصر۔ ارادہ و قدرت میں رکھتا ہوں۔ کلام سے میرا احترام ہے۔

حسرت مدظلہ :۔

کونسی شئے ہے نہیں جو مجھ میں ‏ ‏ ‏ ‏ اک طلسمات کا پُتلا ہوں میں
کیا ملک میری حقیقت کو سمجھتے تم کو ‏ ‏ ‏ ‏ ان کا استاد نہ سمجھا وہ مُعمّا ہوں میں

اُو! "میں" پیارے "میں"!!! طفلی میں تو میرے ساتھ تھا۔ جوانی میں تو میرے ساتھ تھا۔ کہولت میں تو ساتھ ہے۔ پیری میں تو ساتھ رہے گا دانت گر کر جُدا ہو جائیں۔ ہاتھ پاؤں کٹ کر علٰحدہ ہو جائیں۔ مگر تو جُدا نہ ہوگا۔ مرنےکے بعد عمر بھر کا ساتھی۔ تن بھی ساتھ چھوڑ دے گا۔ مگر تو کبھی ساتھ نہ چھوڑے گا۔ لڑکپن میں تو چھوٹا نہ تھا۔ جوانی میں بڑا نہ ہوا۔ بڑھاپا تجھے ضعیف نہ کر سکے گا۔ کیا تو حیات ہے؟ یا علم و قدرت ہے؟ یہ تو میرے صفات ہیں۔ کیا تو ارضی ہے یا سمائی؟ قوی ہے یا ضعیف؟ کالا ہے یا گورا؟ خوبصورت ہے یا بدشکل؟ زنجیرِ قیود میرے پائے فلک فرسا میں ہرگز نہیں پڑ سکتی۔ تو کہاں ہے، کہاں نہیں ہے؟ کب سے ہے اور کب تک رہے گا؟ کمندِ مکان و زماں میرے قصرِ عظمت کے کنگرے تک نہیں پہنچتی۔ سچ کہنا، آخر تو کون ہے؟ اور کیا ہے؟ "میں" صرف "میں" ہوں۔ ساحتِ علمِ الٰہی میں میرے سامنے ہویّتِ مطلقہ کا آئینہ آگیا۔

اور میں اس کے اقتضا کے موافق حباب سرِ دریا معلوم ہونے لگا۔ پھر مثال میں صورت دامنگیر ہوگئی۔ پھر ناسوت میں وزنِ بارِ دوش ہوگیا۔ سب کچھ ہوا مگر اب بھی "میں" صرف "میں" ہوں ؎

موجِ دریائے ارادہ ہوں "میں" حیرت انگیز روانی میری

(حضرت سعید آبادی)

او۔ میری جان! "میں" میری جان کی جان! "میں" میں بھی تیرے سوا کسی کو نہیں چاہتا۔ نوکر چاکر میرے معین و مددگار ہیں۔ بیوی اپنی عزت آبرو تجھ پر قربان کردی۔ اس لئے وہ مرکزِ محبت ہے۔ اولاد تیری چلتی پھرتی تصویر ہے۔ بدن تیرا گھوڑا ہے، جس پر تو میدانِ علمِ تفصیلی و شہادی میں اپنی شہسواری دکھاتا ہے۔ دوسری اکثر چیزیں تیرے گھوڑے کی خاطر ہیں، غرض کہ میں جس کو چاہتا ہوں، تیرے لئے ہی چاہتا ہوں تو اصل ہے، اور دوسرے فرع۔ تو مطلوب ہے، اور دوسرے طفیلی ؎

اسیرِ دامِ گیسوئے محبت آپ اپنا ہوں جو حبِ غیر ہے وابستۂ زنجیرِ نسبت ہے

حضرت مدظلہ

"میں" ہوں "میں" اے پیارے "میں" واہ رے "میں" اللہ رے "میں"
کچھ بھی نہ ہو پروا کیا ہے تو تو ہے اے پیارے "میں"

حضرت مدظلہ

ایک میرا خیال

ایک شب میں پلنگ پر پڑا کروٹیں بدلتا تھا۔ کیا کیا کیا۔ نیند نہ آئی گویا کہ اس نے نہ آنے کی قسم کھائی تھی۔ لاکھ کوشش کی سب بیکار۔ بیکاری سے بیگار بھلا۔ کچھ نہ ہوا تو حضرتِ متخیلہ نے زور دکھایا۔ کہ چل تجھے عالمِ خیال کی سیر کرالاؤں۔ اُن دنوں یونان و ترک میں تیغ و تفنگ برسرِ کار تھے۔ گرمِ پیکار تھے۔ دل نے چاہا کہ اسی کی سیر کرآؤ۔ عِلم میں سب کچھ تھا ہی۔ قدرت نے حرکت کی۔ ارادے نے توجہ کی۔ بس کیا تھا؟ صرف ہاں کی دیر تھی۔ اور سامنے عالمِ خیال تھا۔ اور ایک ہولناک منظر پیشِ نظر۔ یونانی جنگی بیڑا پھریرا اڑاتا، ساحلِ ایشیائے کوچک پر نمودار ہوا۔ بڑی بڑی اژدہا پیکر توبیں گرمِ آتش فشانی ہوگئیں۔ ساحل پر بم باری ہونے لگی۔ ترکوں کے پاس معمولی توپ خانہ اور مٹھی بھر عسکری تھے، آخر ترک تھے! چپ کیا بیٹھتے جواب دیا ہی۔ کسی جہاز کا مستول توڑا۔ کسی کے عرشے پر گولے اتارے۔

کشتی کے تختے پاش پاش کر دیئے۔ کچھ کشتیاں غرق کر دیں۔ مگر ایک کی
دارو دس۔ بھائی بندوں کی امداد۔ دوستوں کی تائید۔ بڑی بڑی قوتیں
بھیس بدل کر ساتھ تھیں۔ زوردار پیادے کو فرزین بھی نہیں مار سکتا۔ غریب
ترک کیا کرتے۔ آخر انہیں پیچھے ہٹنا پڑا۔ پھر کیا تھا؟ یونانی فوجیں معہ معشوقان
پردہ زنگاری کشتیوں میں اتریں۔ وہاں سے ساحل پر آدھمکیں۔ نہ عورت
کو دیکھا نہ مرد کو۔ نہ بچے کو دیکھا نہ بوڑھے کو۔ نہ سپاہی کو دیکھا نہ اہل قلم کو سب کو
تلوار کے گھاٹ اتارنا شروع کیا۔ بلبلا کر امن طلب کرنے والوں کی ایک نہ
سنی گئی۔ غریب رعایا تتر بتر جس کے جدھر سینگ سمائے چل نکلا۔ جو لوگ
نہ جا سکے ان کو قسم قسم کے مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ ذلت و خواری کی
کچھ انتہا نہ تھی۔ گھروں کو آگ لگ رہی ہے۔ مسجدیں مسمار ہو رہی ہیں بڑے
بڑے مکانات زمیں دوز ہو رہے ہیں۔ بڑی بڑی مسجدوں اور عالی شان
سرکاری محل پر ہلال کی جگہ صلیب نے لے لی۔

مدعیان تہذیب و تمدن کی وحشت و بربریت پکار پکار کر چلا رہی
ہے۔ کہ یہ جناب مسیح علیہ السلام کی بھیڑ نہیں۔ بھیڑیئے ہیں۔ ان کے سپید
پوست پر نہ جاؤ۔ ان کے دل سیاہ ہیں۔ ع نہاں درون پنبہ ببین پنبہ دانہ را

یہ غلامی کو دنیا سے مٹانے کے مدعی، دنیا کو غلام بنا لیتے ہیں۔ اسلامی غلامی سے کبھی آزادی مل جاتی تھی۔ بہت سے غلام آزاد ہو کر بادشاہ تک بن گئے ہیں۔ مگر اِن کی غلامی سے آزادی ملنی ناممکن ہے۔ مفتوح لاکھ سُرخ و سفید ہوں، مگر کالے ہی سمجھے جائیں گے۔ اپنی قوم و ملّت کے حامی باغی سمجھے جائیں گے۔ نئی روشنی کے حلقہ بگوشوں نے، تہذیبِ حاضرہ کی خاطر دخترِ رَز کو منہ لگایا کتّوں کے ساتھ زندگی بسر کی، مُخدّرات پردے سے باہر نکل آئیں۔ حُرّیّت، شریعت؟ جس نے شریعت کہا اسے گولی ماردی۔ سب کچھ کیا۔ مگر اُن کی تہذیب ہرگز ہرگز تسلیم نہ کی گئی۔ اس زمانہ میں تہذیب افعال و خیالات کی صفت نہیں۔ اقلیم و قوم کی صفت ہے قدرت خدا کی، مشیت مولیٰ کی! جو ترک عہدِ حمیدی میں ادہم پاشا کے زیرِ کمان صرف ایک ہفتہ میں یونانیوں کے ناقابلِ فتح قلعوں پر قبضہ کرتے، اتھینیا[1] کے قریب پہنچ گئے اور پچا باوا نے بیچ میں پڑ کر صلح کرا دی تھی۔ وہی ترک اب فرار پر قرار پکڑتے ہیں۔ کوئی یونان سے نہیں پوچھتا کہ تجھے ایشیائے کوچک پر حملہ کرنے کا کیا حق ہے؟ سچ ہے، حق قوت کا نام ہے۔ مائیٹ اِز رائیٹ اَلْحَرْبُ سِجَالٌ زمانہ کروٹیں بدلتا رہتا ہے۔ وَتِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُھَا بَیْنَ النَّاس

[1] ایتھنز

بالجملہ ترک ہٹتے ہی چلے اور یونانی بڑھتے ہی چلے۔ چوکی پر چوکی۔ مقام پر مقام۔ شہر پر شہر فتح۔ مہذب یونانی، معصوم بچوں اور بے گناہ عورتوں کا شکار کھیلتے۔ شہدا کے خون سے منہ پر غازہ ملتے، دارالسلطنتِ سمرنا یا ازمیر کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ کہ یہ تو ہمارے بزرگوں کا ورثہ ہے۔ کس کی مجال ہے کہ اس سے ہم کو روکیں؟ جاتے ہیں اور لے لیتے ہیں۔ نشۂ باطل پرستی میں جھومتے جھامتے چلے ہی ہیں کہ تقدیر نے بساط الٹی، زمانے نے کروٹ بدلی۔ جنگ کا رنگ اور سے اور ہو گیا۔ اناطولیہ سے مذہب کے دلدادہ، خدا اور رسول کے دیوانے ہاتھ میں تلوار، ہتھیلی میں سر سرمستیِ شوقِ شہادت میں اللہ اکبر اللہ اکبر کے نعرے مارتے۔ امداد کو نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر کیا تھا؟ شکست فتح سے مُبدل ہو جاتی ہے۔

ذرّہ ہائے کوہ سے بڑی بڑی توپیں آتش فشانی کر رہی ہیں۔ کمیں گاہوں سے بندوقوں کی باڑ پر باڑ پڑ رہی ہے۔ بندوقوں پر سنگین چڑھائے مجاہدین آگے بڑھتے ہیں۔ بڑے سخت دل ہیں۔ کچھ رحم نہیں کرتے۔ نہ سپاہی کو دیکھتے ہیں نہ افسر کو۔ بس سب کو نوکِ سنان پر دھر لیتے ہیں۔ غریب یونانی بھاگتے ہیں تو حضرت عزرائیل آواز دیتے ہیں۔

تمھارا وطن بہت دور ہے۔ آؤ، ہم کو تمھارے حقیقی وطن کو پہنچا دوں
جناب مالک چلا اٹھتے ہیں۔ ترک بڑے بے مروّت ہیں۔ انہوں نے
سمرنا کے دروازے تمھارے سامنے نہیں کھولے۔ تم میرے پاس آؤ۔
تمھارے لئے یہاں سب دروازے کھلے ہوئے ہیں۔

یونانیوں کو رجعتِ قہقری کرنی پڑتی ہے۔ نہایت سخت نقصان
کے ساتھ جدھر سے آئے تھے اُدھر واپس ہونا پڑتا ہے۔ کھسیانی بلی کھمبا
نوچے۔ بھاگتے بھاگتے راستہ میں جو مِلا اُسے شہید کر ڈالا۔ چلتے چلتے غریبوں
کو گولیاں ماردیں۔ جو دیہات بیچ میں پڑے انہیں سطحِ زمین سے ملا دیا۔
اِس خبرِ وحشت اثر کو بھائی بندوں نے سنا۔ تو دنیا آنکھوں میں اندھیر ہوگئی
والین پُیر تیغ بکف گھروں سے نکل کھڑے ہوئے۔

بڑے بڑے تجربہ کار سپہ سالار مشوروں کے لئے آپہنچے۔ اہلِ دولت نے
تھیلیوں کے منہ کھول دیئے۔ سونا پانی کی طرح بہنے لگا۔ روپیوں کی جھنکار
سنائی دینے لگی۔ ساز و سامان ہر جگہ سے پہنچنے لگا۔ بارود گولے۔ جنگی موٹر کار
ہوائی جہاز۔ امداد کے لئے آگئے۔ یونانی پشت بانوں کی پشت گرمی سے قوی
دل ہو کر سنبھلے۔ اور دوبارہ خونریز جنگ شروع ہوگئی۔ لاکھ دو لاکھ کی

فوج جمع ہو گئی تو یونانی بھپر سمرنا کی طرف بڑھنے کے منصوبے سوچنے لگے۔
سپہ سالارِ اعظم یونان ایک مجلس میں مشیرانِ جنگ کے ساتھ آئندہ فتوحات اور طرزِ جنگ پر گفتگو اور عظیم الشّان نقشے تیار کر رہا ہے کہ ایک ترک سپاہی نے مجلسِ مذکور میں آکر سپاہ سالار کو سلام کیا کہ سپاہِ یونان نے ہتھیار ڈال دئیے سپہ سالارِ ترک جناب کو یاد فرماتے ہیں۔ تاکہ مزید خونریزی موقوف اور ہر طرف امن و آمان ہو جائے۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہ - میں کیا بیکار تخیلے پکانے میں مصروف تھا۔ پڑھے لکھے حضرات میں یہی بڑا عیب رہتا ہے۔ بیضرورت خیالات میں مشغول۔ ضروری ہی خیال سہی۔ اس کے بار بار اعادہ کرنے میں کیا فائدہ؟ عمر بڑی بے بہا چیز ہے۔ اس کو لاطائل اوہام میں ختم کرنے سے کوئی نتیجہ؟ جو وقت یادِ خدا میں گزرتا تھا۔ اس کو بیکار تخیل میں گذارنا عقلِ سلیم کے خلاف ــــ نہیں اس تخیل میں مجھے کوئی روشنی نکلتی معلوم ہوتی ہے۔ اچھا آؤ۔ اس تخیل پر ذرا غور کریں۔
کیا ان میرے خیالات کا مجسم و متشکل ہو کر سامنے آجانا بغیر میرے ممکن ہے؟ ہرگز نہیں۔ ہرچند کہ خلّاقِ دو عالم کی مثال مخلوقات میں ممکن نہیں تاہم یَتَفَکَّرُوْا فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا

باطلاً کا حکم ہے۔ وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ کا ارشاد ہے۔ کیا قباحت ہے اگر کسی سچی بات کی طرف اس خیال میں سے راستہ نکل آئے۔ ہاں تو، جس طرح یہ خیال بغیر میرے ممکن نہیں، اسی طرح مخلوق کا وجود بھی بغیر خالق کے ممکن نہیں۔ کیونکہ عالم ممکن ہے۔ ممکن کا وجود بالعرض اور بالغیر ہے۔ اور خالق واجب ہے اور بالذات موجود ہے۔ اگر میں سو جاؤں یا ایک لمحہ ان خیالی پتلوں سے غفلت کروں، تو کیا یہ خیالی پتلے قائم رہ سکتے ہیں؟ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ ان کی بقا کے لئے ہر آن، ہر لحظہ میری توجہ کی ضرورت ہے۔

اسی طرح عالم کا ہر ذرّہ، ہر آن، ہر لحظہ خدائے تعالیٰ کی توجہ اور امداد کا محتاج ہے۔ لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ۔ کیا یہ خیال نیستِ محض سے آیا ہے؟ نہیں یہ خیال علم میں تھا۔ اور اب بھی علم سے کب باہر ہے؟ عالم بھی علمِ الٰہی میں تھا اور اب بھی علمِ الٰہی سے خارج نہیں۔ علم کے مختلف اطوار ہیں۔ یہ بھی اس کا ایک طور ہے۔

اس خیال سے پہلے کیا تھا؟ میں تھا۔ میری ذات تھی۔ ذات کے بعد حیات و زندگی کا مرتبہ ہے۔ علم میں مختلف معلومات تھے۔ میں اِن معلوم کو جانتا اور دیکھتا تھا۔ اِن کے اقتضاآت ولوازم کو سنتا اور سمجھتا تھا۔ اُن کو

موجود و متشکل کرنیکا ارادہ کیا جو فرعِ قدرت ہے۔ پھر کیا تھا؟ بس ایک ہاں
کہنا ہی تھا اور خیال پیشِ نظر تھا۔ اسی طرح پہلے خدا کی ذاتِ پاک تھی۔ پھر
ذات کے مرتبے کے بعد حیات و علم و بصر و سمع و قدرت اور ارادہ و تکلم
کے مرتبے ہیں۔ کُن کا امر ہونا ہی تھا کہ عالم موجود تھا۔ جو بالذات موجود
نہ بلکہ اسی کے وجود سے وابستہ ہے۔ بلکہ اسی کا ایک جلوہ ہے۔ عالم جو علم
میں ثبوت رکھتا تھا، اس پر نورِ وجود پڑا اور وہ موجود ہوا۔ معلوماتِ ذہنی
کو اعیانِ ثابتہ اور معلوماتِ خارجی کو اعیان یا اعیانِ خارجیہ کہتے ہیں۔
وُجودِ ذہنی کو ثبوت اور وُجودِ خارجی کو وُجود۔

اس جنگ کے متخیلے کا ایک خاکہ اور ایک نظام ہے اس نظام کے مطابق ہر ایک
چیز نمودار ہوئی ہے، برسرکار ہوئی ہے۔ اگر یہ نظام نہ ہوتا تو واہی تباہی خیالات
کا مجموعہ ہوتا۔ یہ جنگ کا تماشا کہاں ہوتا؟ یہ باقاعدگی کدھر ہوتی؟

دنیا میں جو کچھ نمایاں ہو رہا ہے، ایک نظامِ کُلی کے ماتحت ہے
جس کو "قدر" کہتے ہیں اور جزئیات جو اس نظام کے ماتحت پیدا و نمایاں
ہو رہے ہیں، وہ "قضاء" ہے۔

اگر اس نظامِ خیال میں کوئی دوسرا شریک ہوتا، تو یہ حسنِ ترتیب اور

باہم ارتباط کیونکر رہتا۔ میں کچھ اور چاہتا، دوسرا کچھ اور چاہتا جس کا نتیجہ خیال کی برہمی ہوتی۔ بعض دفعہ اختلاجِ قلب یا بیماری نے ایک اچھے مستقل خیال کو برقرار رہنے نہ دیا۔ اسی طرح متعدد خدا ہوتے تو دنیا برباد ہوتی۔ دو مُلّاؤں میں مرغی مردار ہوتی۔ ایک تن میں دو جانیں، ایک میان میں دو تلواریں، ایک ملک میں دو بادشاہ نہیں سما سکتے۔ کیا یہ میری خیالی صورتیں مجھ سے باہر ہیں؟ کیا میں ان کے اوپر ہوں، یا نیچے؟ سیدھے جانب ہوں یا بائیں؟ آگے ہوں یا پیچھے؟ نہیں میرے خیالات مجھ ہی میں ہیں۔ مجھ سے ہرگز باہر نہیں۔ اِن کی شش جہت میں، میں ہی میں ہوں۔ انہیں ہر طرح احاطہ کئے ہوئے ہوں۔ اسی طرح عالم کے ہر ذرّہ کو ذاتِ الٰہی محیط ہے۔ اس کے ذاتی احاطے سے کوئی شئے خارج نہیں اَیۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡہُ اللّٰہِ۔ کون سی جہت ہے جدھر خدا نہیں۔

ان خیالی صورتوں میں سے کون سی صورت ہے جس کو میں نہیں جانتا ان کو، ان کی ہر حرکت و سکون کو میں جانتا ہوں۔

اسی طرح خدائے تعالیٰ بھی کلّیات و جزئیات جو کچھ آسمانوں میں ہے یا زمین میں، ان سب کو جانتا ہے کوئی ذرہ اس کے علم سے باہر نہیں۔

لَا یَعۡزُبُ عَنۡ عِلۡمِہٖ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ فِی السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ غرض کہ خدائے تعالیٰ کے لئے احاطۂ ذاتی و احاطۂ علمی دونوں ثابت ہیں ۔

ان خیالی پتلیوں کو کچھ ذاتی زور و قوت ہے؟ یا ذاتی ارادہ ہے؟ نہیں، نہیں ۔ان کا زور ہے، تو میرا ہے ۔قوت ہے، تو میری ۔ارادہ ہے، تو بالذات میرا ہے ۔جو ارادہ کروں، وہی ان پتلیوں سے نمایاں ہوگا جس کو چاہوں، نیست و نابود کر دوں ۔ان پتلیوں کی مقدور بھی ہے ۔کہ میرے ارادے سے سرتابی کر سکیں ۔نہیں، ہرگز نہیں ۔

اسی طرح کسی مخلوق کو بالذات زور ہے، نہ قوت ۔نہ بالذات ارادہ ہے، نہ حرکت ہے ۔یہ قدرتِ ذوالجلال کا کرشمہ ہے ۔لَا حَوۡلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ سب میں اس کا ارادہ ہے ۔اس کے ارادے کا سارا تماشا ہے ۔مَا تَشَآءُوۡنَ اِلَّآ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۔

کیا یہ خیالی پتلے مرتے ہیں، تو میں مرتا ہوں؟ یا دوڑتے بھاگتے ہیں، تو میں دوڑتا بھاگتا ہوں؟ نہیں ۔مرتے ہیں تو پتلے ۔دوڑتے بھاگتے ہیں، تو پتلے ۔میں ان کو بھی پیدا کرتا ہوں، ان کے کاموں کو بھی ۔میں زندہ سلامت ہوں ۔اپنی جگہ پر قائم ہوں ۔تغیر ہے تو ان میں ہے میں تو جوں کا

توں ہوں ۔ اسی طرح اچھا کام کرتا ہے، تو بندہ ۔ بُرا کام کرتا ہے تو بندہ ۔
خدائے جل جلالہٗ ہمارا، ہمارے افعال و اعمال کا پیدا کرنے والا ہے ۔ اسی
وجہ سے بندے کو کاسبِ افعال، اور خدا کو خالقِ افعال کہتے ہیں لَهَا مَا كَسَبَتْ
وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۔ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے ۔ جیسا بوؤ گے ویسا
کاٹو گے ۔ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ۔ تم کو پیدا کیا تو اس نے، تمہارے کام
کو پیدا کیا، تو اس نے ۔ یونانی خیالی پتلے نے ترکی خیالی پتلے کو مارا ۔ یا ترک
پتلے نے یونانی کو ۔ تو اچھا کام ہوا ؟ یا برا ؟ خیر ہوا یا شر ؟ ترکوں کا کام
یونانیوں کے حق میں ۔ یونانیوں کا کام ترکوں کے حق میں بد ہے ایک لحاظ
سے دیکھو تو یونانیوں نے ترکوں کے ملک پر ناحق، ناروا حملہ کیا ہے ۔ لہٰذا
ان کا فعل بد ہے ۔ اور ترکوں نے مدافعت کی ہے، بنابریں ان کا کام
نیک ۔ نظامِ خیالی اور نقشۂ جنگ کے لحاظ سے دیکھو تو ہر چیز ۔ ہر فعل کا ارادہ
اپنے وقت پر، اپنے محل میں ہونا ضرور ہے ۔ لہٰذا اس نظامِ خیال کے لئے
ہر شئے خیر ہی خیر ہے ۔

اسی طرح مخلوقات کے کام باہم ایک دوسرے کے حق میں بعض مضر
اور شر ہیں، اور بعض مفید اور خیر ۔ اس کو خیر و شر اضافی کہتے ہیں ظلم کرنا برا،

ظلم کا رفع کرنا اچھا ہے۔ اس کا نام خیرِ کثیر اور شرِ قلیل ہے۔ دنیا کے تمام قوانین خیرِ کثیر پر مبنی رہتے ہیں۔ شرع اور احکام مذہب سب خیرِ عظیم پر مشتمل ہوتے ہیں۔ پانی برستا ہے، دنیا سرسبز و شاداب ہوتی ہے۔ کسی بڑھیا کی جھونپڑی گر جائے تو گر جائے چیونٹی کے سوراخ میں پانی چلا جائے تو ہزار دفعہ چلا جائے۔ اس پر احکام مرتب نہیں ہوتے۔ احکام و قوانین خیرِ کثیر و شرِ قلیل پر قائم ہوتے ہیں۔ خیرِ کثیر کو حاصل کرتے ہیں اور شرِ قلیل سے اجتناب کرتے ہیں۔ یہی عقل کا تقاضا ہے اور حکمت کا مقتضا

عالم کے نظامِ اکمل اور خدائے تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کے لحاظ سے دیکھو تو جو کچھ ہو رہا ہے، خیر ہی خیر ہے۔ وہی فعل باہم ایک دوسرے کے لحاظ سے شر اور خدائے تعالیٰ کی حکمتِ تامّہ کے اعتبار سے خیر۔ دنیا کی رنگا رنگی، اور عالم کی بوقلمونی اس کے کمالِ قدرت اور نہایتِ حکمت کی نشانی ہے۔ جن افراد پر سرِ قدر اور رازِ حکمت کھلتا ہے، ان کو دائمی سرور اور ابدی اطمینان اور کمالِ عرفان نصیب ہوتا ہے۔ خدائے تعالیٰ اپنے عرفان سے، ایمان اور اطمینان سے ہم کو بھی سرفراز فرمائے۔ آمین ثم آمین۔
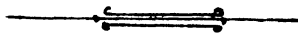
عینیت و غیریت

عینیتِ محضہ کیا حق و باطل ۔ واجب و ممکن ۔ رب و عبد دونوں عینِ محض ہیں ؟ اگر دونوں عینِ محض ہیں اور کسی قسم کا باہم امتیاز نہیں ہے تو جو حکم ایک پر لگتا ہے، وہی دوسرے پر بھی لگنا چاہیئے ۔ مخلوقات میں جو عیوب و نقائص ثابت ہیں وہ خالق میں بھی ثابت ہونا چاہیئے ۔ پھر چونکہ جس طرح ایک مخلوق عینِ خالق ہے اسی طرح دوسرا مخلوق بھی عینِ خالق ہوگا ۔ تو جو حکم ایک مخلوق کا ہوگا ۔ وہی حکم دوسرے مخلوق کا بھی ہوگا ۔ اور یہ بداہت کا انکار اور حس کی مخالفت ہے ۔ کَبُرَتْ کَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ يَقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا اس شخص کی بصیرت یا بصارت ہی ہوتی تو ایسا کہنے کی جرات نہ کرتا ۔ آگ جلاتی ہے، برف سرد ہوتی ہے ۔ کل جزء سے بڑا ہوتا ہے ۔ انسان سمجھتا ہے، جانور بے عقل ہوتا ہے ۔ ہاتھ سے پکڑتے ہیں ۔ پاؤں سے چلتے ہیں ۔ بادشاہ حاکم ہوتا ہے اور رعایا محکوم یہ تمام حقائق ہیں اور ثابت ہوچکے ہیں ۔ اس سے

کوئی عاقل انکار نہیں کرسکتا۔ اگر انکار کرے تو وہ عاقل نہیں غافل ہے۔
اِس کا جہل، اس کی بدتمیزی نقطۂ کمال کو پہنچ گئی۔ تَعَالَی اللّٰہُ عَمَّا یَصِفُوْنَ۔
وہ نہ صرف احکامِ شریعت کو برباد کرتا ہے، بلکہ قوانینِ طبیعت کی بھی مخالفت
کرتا ہے۔ چھوٹا کم سمجھ بچہ بھی خوش ذائقہ شیریں آم پر دوڑتا ہے۔ اور تلخ بدمزہ
دوا سے بھاگتا ہے۔ دراصل اس شخص کی آنکھوں پر غفلت کا پردہ پڑا ہوا ہے
وَعَلٰی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَۃٌ حق و باطل میں کچھ فرق نہیں کرسکتا۔ وَمَا قَدَرُوا
اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ ؎

توجانِ پاکی سر بسر نے آب و خاک آمیز نیں   واللہ ز جاں ہم برتری روحی فدا ک آمیز نیں
(جامی علیہ الرحمہ)

اس کو قوانینِ شریعت کی مخالفت سے پہلے قوانینِ سلطنت و نوامیسِ طبیعت
کی مزاحمت پر کمرِ ہمت باندھنی چاہیئے۔ قانونِ سلطنت کی مخالفت اس
کو خوب ٹھوکرا اور قیدِ سخت میں ڈالکر اس کی آنکھوں سے اس بدتمیزی کا پردہ
اٹھادیگی۔ اور ناموسِ طبیعت کی مزاحمت اسے پانی میں ڈبوکر مار ڈالے گی
یا آگ میں جلاکر پھونک دیگی یقین رکھو کہ وہ قوانینِ شریعت کی مخالفت کرے گا
تو خَسِرَ الدُّنیا والآخِرَۃَ ذٰلِکَ ھُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ کا مصداق
ہوجائے گا۔ ہر شئے کی ایک حقیقت ہے، اور ہر حقیقت کے جدا آثار مرتب ہیں

ایک حکم ہے۔ اور مستحق کو اس کا حق نہ دینا ظلم ظلم ظلمت ہے، اور تعدی ضلالت ؎

گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی (جامی علیہ الرحمہ)
ہر مرتبہ از وجود حکمے دارد

غیریتِ محضہ | کیا بیچارے ممکن کو امکان ہے کہ ذاتِ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ کے مقابل اپنی ہستی کا دعویٰ کرے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ۔ اتنا بڑا جرم؟ اتنی بڑی جرأت؟ شرک! شرک!! شرک!!! کیا کسی باطل کو یارا ہے کہ حق کے سامنے کسی کمال کا اِدّعا کرے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ اس قدر جہالت، اور اس مایہ ضلالت ظلم! ظلم!! ظلم!!! لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔ اے نسبتِ ہست نما! اپنے گریبان میں سر ڈال کر دیکھ تو کہ تیرا حقیقتہً کچھ پتہ بھی ہے ؎

ہے عجب رہِ حقیقت کہ نہیں نشانِ خلقت
یہ کہاں مجالِ باطل کہ وہاں وجود پاتا (حسرت حیدرآبادی)

کُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ اَصْدَقُ کَلِمَۃٍ قَالَتْهَا الْعَرَبُ قَوْلُ لَبِیْدٍ اَلَا كُلُّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللہَ بَاطِلٌ ؎ رباعی

زعمِ باطل کی تجھ کو مستی کب تک
ناداں یہ ادعائے ہستی کب تک
تو بھی موجود اور حق بھی موجود
ظالم یہ شرک و خود پرستی کب تک (حسرت حیدرآبادی)

غیریتِ حقیقی و عینیتِ اعتباری جس صاحبِ فن سے پوچھو کہ تمہارا کمال کس امر میں ہے؟ تو وہ کبھی نہ کہے گا کہ جہلِ مرکب اور خلافِ واقعہ جاننے میں قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ۔

کس قدر تعجب کی بات ہے کہ بعض حضرات کے پاس کمال ہے: تو جہلِ مرکب میں کیا کیا ریاضتیں کیں کیسی کیسی محنتیں اٹھائیں۔ قرب وفنا کے لئے۔ اس میں کیا ہوا؟ ایک غلط خیال پیدا ہوا۔ ایک جہلِ مرکب جائے گیر ہوا یعنے لوہا آگ کے قرب کی وجہ سے "انا النار" چلا اٹھا۔ وہ سمجھتے ہیں۔ لوہا لاکھ گرم ہو کر سُرخ انگارا ہو جائے۔ ہاتھ کو جلا کر خاک سیاہ بنا دے مگر ہے لوہا ہی۔ چاندِ بدرِ کامل بنکر ہزار چمک دمک دکھلائے مگر ہے وہی تاریک جرم کا۔ ممکن واجب کے قرب کی وجہ سے خود اپنی آنکھوں سے چھپ جائے اور "انا الحق" چلا اٹھے۔ مگر ممکن واجب نہیں ہو سکتا۔ بندہ خدا نہیں ہو سکتا۔ ممکن پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے۔ مگر کوئی غور کر کے جواب دے۔ وہ پہلے ہی کیا تھا؟ عدم۔ عدم پایا جائے تو نابود: بود ہو جائے۔ انقلابِ ماہیت ہو جائے۔ ممکن موجود ہو تو وجود میں خدا کا شریک ہو۔ اللہُ اکبر۔ وجود اشرفِ صفات ہے۔ جب

اس میں شرک کیا اور دوسرے امور میں شرک سے احتراز۔ تو اس سے کیا حاصل؟ بارش سے بھاگ کر میزاب کے نیچے پناہ لی تو کیا فائدہ؟ بچھو سے ڈر کر سانپ سے ڈسوایا تو کیا کوئی عاقلانہ کام کیا؟ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ تو کہا مگر اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ نہ پڑھا تو کیا نماز ہوئی؟ توبہ! توبہ! ع

این خیال است و محال است و جنوں

عینیتِ وجودی غیریتِ علمی آخر یہ ہے کیا معمی؟ عینیت میں زندقہ غیریت میں شرک۔ ایک طرف بداہت کا انکار اور شریعت کی مخالفت۔ ایک طرف عقلِ سلیم کا خلاف اور ایمان سے مُبایَنَت۔ ایک طرف کھائی ایک طرف خندق۔

بات یہ ہے کہ وجودِ حقیقی جزئی حقیقی ہے۔ ناقابلِ تکثر ہے۔ اس کے مقابل کوئی شئے نہیں۔ اگر کوئی شئے ہو سکتی ہے تو عدمِ محض۔ نیستی بحت اور سلبِ بسیط۔ سلبِ بسیط اور ہونا؟ وہ سلبِ بسیط ہی کیا ہوا؟ سلبِ بسیط تو اسمِ بلا مسمیٰ ہے۔ مفہومِ بلا مصداق ہے۔ وجود ہی سب کچھ ہے۔ کوئی شئے دائرۂ وجود سے خارج نہیں۔ وہی ذات ہے وہی موجود ہے۔ وہی نور ہے۔ وہی حیات ہے۔ وہی علم ہے۔ قدیم اور بالذات موجود ہے۔

وجود یا وجود بسیط ہونے کے، تمام صفاتِ متضادّہ کا منشاء ہے۔

بعدِ انتزاع، علم میں کثرت ہے۔ اور اس کا منتزع عنہ محض وحدت ہے

دیکھو دائرہ ایک بسیط شکل ہے۔ اس سے نقطہ، محیط، قطر، قوس وغیرہ

انتزاع کئے جاتے ہیں نقطہ کو نہ طول ہے، نہ عرض۔ قطر کو طول ہے عرض

نہیں۔ محیط قطر سے ۳½ حصہ بڑا ہے۔ ذرا غور کرو کہ ایک بسیط شکل سے

کتنے مختلف الاحکام امور انتزاع کئے گئے ہیں ؎

دائرے سے منتزع ہیں مرکز و قطر و محیط　　شانِ وحدت سے ہوئی ہے شانِ کثرت آشکار

(حسرت حیدر آبادی)

کیا یہ انتزاعی امور غلط ہیں؟ ہرگز نہیں۔ کیا یہ جہلِ مرکب۔ من گھڑت اور

اختراعی امور ہیں؟ کبھی نہیں۔ کیا یہ ہمارے اعتبار کے تابع

اور ہمارے خیال پر منحصر ہیں؟ کیا ہم قطر کو محیط سے بڑا خیال کر سکتے

ہیں؟ کیا محیط کو خطِ مستقیم سمجھ سکتے ہیں؟ اور نقطہ کو تقسیم کر سکتے ہیں؟ ہرگز

ہرگز نہیں۔ منشاء ہی صحت و سُقم۔ حق و باطل۔ صدق و کذب کا معیار ہے

گو منشا واحدِ محض ہے، مگر اس میں مختلف الاحکام امور کے انتزاع کی قابلیت

ہے۔ اسی طرح وجودِ حقیقی سے حیات، وعلم، وقدرت انتزاع ہوئے ہیں۔

یہ صفات منشاء کے لحاظ سے عینِ ذات ہیں اور انتزاعی ہونے کے

اعتبار سے غیرِ ذات اور باہم بھی غیر۔
علمِ حق میں کیا شئی نہیں؟ سب کچھ ہے۔ کوئی حقیقت، کوئی مفہوم کوئی اعتبار دائرۂ علمِ الٰہی سے باہر نہیں۔ یہی اعتبارات، یا اعیان، یا حقائق، یا ماہیت و ہویات، ذاتِ حق سے منتشی و پیدا ہوئے ہیں۔ یہ ظہورِ علمی فیضِ اقدس جعلِ بسیط کہلاتا ہے۔ ہر حقیقت کے جدا جدا آثار اور مختلف احکام ہیں۔ ہر حقیقت و عین، ذواتِ ممکنہ میں سے ایک ذات ہے جو اس کے صفات کا مرجع ہے۔ نقائص و عیوب، ذات و حقیقتِ ممکن کی طرف منسوب ہوں گے۔ نہ کہ ذاتِ حق کی طرف۔ گو ذاتِ حق وجودِ برحق ہے۔ ان حقائق و اعیان کو اس قابل بنائے گا کہ ان سے آثار نمایاں ہوں۔ ہر عین کو اپنے صفات و اسماء سے ملائے گا اور اس عین کی استعداد کے موافق آثار و احکام ظہور کریں گے۔ اس کا نام فیضِ مقدس و جعلِ مرکب ہے تماشا یہ کہ علم قدیم، اسماء و صفاتِ الٰہیہ قدیم، ان کے اجتماع سے ظہورِ معلومات حادث۔ دیکھو تانبا سرخ بسیط قدیم جست خاکستر گوں بسیط قدیم۔ ان کے ملنے کے بعد پیتل پیدا ہوا۔ زرد مرکب حادث۔ ہائیڈروجن غیر مرئی گیس قدیم۔ آکسیجن غیر مرئی گیس قدیم۔ ان کا

مرکب پانی مٹی مائع حادث۔ ماہیت طبیعت حقیقتِ عین شجر کو سمجھو
تو وہ معانی ہیں سے ایک معنی ہے۔ اور ایک خیالی بات ہے مگر عناصر
اس حقیقت کے ماتحت باہم اجتماع کرتے اور گرہ کھاتے ہیں تو بیج، بن۔
شاخ۔ برگ۔ گل۔ بار۔ سب کچھ نمایاں ہو جاتے ہیں۔ پھر ہم اس کے
پھل کھاتے ہیں۔ پھول سونگھتے ہیں۔ پتے۔ چھال، جڑیں۔ دواء میں
استعمال کرتے ہیں۔ درخت سوکھتا ہے تو کٹوا کر شہتیر۔ تختے۔ تخت۔ میز،
کرسیاں بناتے ہیں۔ دیکھو ہیں وہی عناصر۔ ان کے تعیّنات اور ظہور
جدا جدا ہیں۔ ہر تعین کا حکم جدا۔ اثر جدا ہوتا ہے۔

دور کیوں جائیں۔ ہم اپنے آپ پر کیوں نہ غور کریں۔ آدمی کو میں
جانتا ہوں۔ گھوڑا بھی میرے ذہن میں ہے۔ میں ان کو اپنے خیال میں
پیدا کرتا ہوں۔ میرا ارادہ ہونا ہی تھا کہ آدمی بھی پیدا ہو گیا۔ گھوڑا بھی
کیا خوبصورت آدمی ہے؟ کیا رنگ روپ ہے۔ کیا آنکھ ناک ہیں۔ کیسے
درست ہاتھ پیر ہیں؟ اعضاء میں کتنا تناسب ہے؟ کیا حسیت و چالاک
ہے؟ کیا عمدہ لباس ہے؟ گھوڑا بھی اچھا ہے۔ چہرہ مہرہ۔ جوڑ بند کان
کنوتی۔ دُم ایال۔ بال، بھونری۔ آگاہ، پیچھا۔ سب کچھ درست ہے؟

اوہو! آدمی کس حیثیت سے گھوڑے پر سوار ہو گیا؟ لگام پر ہاتھ، رکاب میں ایک پانوں جانا ہی تھا کہ گھوڑے کی پیٹھ پر تھا۔ ماشاءاللہ! گھوڑا گردن اٹھائے، چھاتا تانے۔ دُم چنور کرتا۔ فراٹے بھرتا ہوا سے باتیں کرتا چلا جا رہا ہے۔

ذرا غور کرو! آدمی اور گھوڑا کیا میری ذات سے جدا قائم ہیں؟ ہرگز نہیں۔ میرا علم، میرا خیال، مجھ سے جدا اور میرے بغیر کیوں کر قائم رہ سکتے ہیں؟

آدمی کی حقیقت میں کیا دُم ایال ہیں؟ نہیں وہ تو گھوڑے کے ہوتے ہیں۔ کیا آدمی کے چار پیر ہوتے ہیں؟ نہیں آدمی کے دو ہاتھ، دو پیر ہوتے ہیں۔ گھوڑے کے چار پیر ہوتے ہیں۔ کیا آدمی زمین کی طرف جھکا ہوا۔ اس کا منہ لمبوترا ہوتا ہے؟ نہیں آدمی سیدھے قد کا، گول چہرے کا ہوتا ہے۔ کیا آدمی گھوڑے پر حکومت کرتا ہے یا بالعکس؟ نہیں آدمی میں عقل ہے۔ علم ہے۔ حاکمانہ شان ہے۔ یہ آدمی اور گھوڑے کے حقائق ہیں۔ اور ان کے مختلف استعدادات ہیں۔ اور گوناگوں اقتضائات، جس کے مطابق تمام ظہورات ہو رہے ہیں کیا آدمی اور گھوڑا۔ میرے ارادے کے بغیر

حرکت کر سکتے یا دیکھ سکتے یا سمجھ سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ مجھ سے بھاگ کر باہر جا سکتے ہیں؟ کیا مقدور۔ کیا میں ان کو ہر طرح احاطہ کیا ہوا نہیں ہوں؟ کیوں نہیں۔ کیا ان کی بقا کے لئے میری مسلسل توجہ کی ضرورت نہیں؟ بیشک ہے۔ اگر میں سو جاؤں تو کیا ہو گا؟ آدمی نیست و نابود۔ گھوڑا مفقود۔ کیا ان کے فعل، ان کی صفت، ان کی ذات میں سے کوئی بھی بالذات و حقیقی ہے؟ خیالی پتلے کی کون سی چیز اصلی و بالذات ہوتی ہے؟ کوئی نہیں۔ وجود ہے تو، بالذات میرا ہے۔ حیات ہے تو میری علم ہے تو میرا۔ قدرت ہے تو میری اور یہ تمام کھیل میرا اور میرے علم کا ہے۔ کیا گھوڑا دوڑتا ہے تو میں دوڑتا ہوں؟ کیا گھوڑا گھاس کھاتا ہے تو میں گھاس کھاتا ہوں۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ؟ میں ہی تو بیٹھا سارا خیالی کھیل کھیل رہا ہوں۔ میں؟ اور گھوڑا اور اس کے صفات؟ گھوڑا میرا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ چاہوں تو اس کو خیال میں پیدا کروں چاہوں تو اس کو نیست و نابود کر دوں۔ یہ کثرتِ خیال کس سے قائم ہے؟ مجھ سے۔ تو کیا میں کثیر ہوں؟ نہیں میرے معلومات کثیر ہیں۔ میں تو محمد عبد القدیر صدیقی ہوں۔ اور ذاتِ واحد ہوں۔ کیا کثرتِ معلومات سے میری وحدتِ ذاتی میں کوئی فرق آ سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ خیالات میں تغیر و تبدل ہوتا ہے

اور میں اور میرے صفاتِ ذاتیہ جوں کے توں رہتے ہیں ؎

سینکڑوں شکلیں بنائیں اور مٹا ڈالا انہیں
مشغلہ اچھا ملا ہے جی بہلنے کے لئے
(حسرت سعید آبادی)

اس امر پر بھی خوب غور کرو کہ خواب و تخیّل میں تمہاری خیالی صورتوں کے سوائے اور کچھ نہیں ہوتا مگر خواب میں بسا اوقات تم نے خود کو بھی دیکھا، اور اپنے دوستوں کو بھی اور اپنے دشمنوں کو بھی۔ باہر سے تو تمہارا دوست یا دشمن تمہارے دل و دماغ میں نہیں آگھسا! اصل یہ ہے کہ جس خیال کو غیریت کے اعتبار سے ملاحظہ کرو وہ غیر ہو گا۔ جس خیال کو محبت کے لحاظ سے دیکھو تو وہ دوست ہو گا۔ عینیت کے خیال سے تو عین۔

اسی طرح یہ حقایق و اعیانِ ممکنات اپنے صفات کے مرجع اور ان کے ذوات ہیں۔ یہ ذوات و حقائق و اعیان معلوماتِ واجب اور قائم بذاتِ حق ہیں۔ سمجھنے میں اور علم میں دو چیزیں ہیں۔ (۱) ذاتِ حق (۲) ذواتِ ممکن۔ واقع، منشاء، خارج میں بالذات ایک ہی ایک ذات ہے، وہی وجود ہے۔ وہی موجود ہے۔ وہی شاہد ہے وہی مشہود ہے۔ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

اک وہم خودی ہی جس پہ مغرور ہے تو | جو یاجس کا ہے اس سے کھب دور ہے تو
اٹھ جائے اگر بعدِ خیالی کا حجاب | آنکھیں جسے ڈھونڈتی ہیں وہ خود ہے تو
(حسرت حیدرآبادی)

رنگِ روشن کا ایک دھوکا ہوں میں | خورشیدِ جہاں تاب کا دھبا ہوں میں
میں ہوں بھی ہاں اور نہیں ہوں بھی | حسرت بخدا عجب تماشا ہوں میں
(حسرت حیدرآبادی)

توحید۔ فنا۔ تجلّی

امکان کی شان سے ہے، اس کے وجود و عدم کا برابر ہونا۔ بندہ کے لوازم سے ہے، کسی شئی کا مالک نہ ہونا اَلْعَبْدُ وَمَا مَلَکَتْ یَدَاہُ لِمَوْلَاہُ۔ غنائے مطلق حضرت واجب عزّ و علا کے ساتھ خاص ہے۔ اَللّٰہُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ۔ جس کی حقیقت میں افتقار و احتیاجِ محض ہو اس کے دونو ہاتھ خالی رہیں گے۔ جس کی ذات بالعرض ہو، وہ ہر آن ہر لحظہ ذاتِ بالذات کے دستِ قدرت کی طرف نگران رہے گا ہی۔ جُوْا دَعَلَی الْاِطْلَاق حضرت عمّ نوالہ کا نام ہے۔ مانگنا، دامن پھیلانا

ہمارا کام ہے۔ بلکہ دامن از کجا آرام کہ جامہ ندارم ۔ رباعی

توُ میرا خدا ہے میں ہوں تیرا بندہ حاجت مجھ میں ہے اور ہے تجھ میں غنا
جب ہے صفتِ ذات کا اظہار کمال میں مانگتا جاؤں اور تو دیتا جا

حضرت حیدرآبادی

توحید :۔ ذات واجب کو یگانہ سمجھنے کا نام ہے۔ ممکن کی احتیاجِ ذاتی کا منکشف ہو جانا "فنا" کہلاتا ہے۔ قَیُّومِ ذُوالجلال کے ہر امر کے بالذات ہونیکا پتہ چل جانا "تجلی" کے نام سے موسوم ہے۔ بالجملہ "توحید" جاننا ہے "فنا" نسبت اِلَی الخلق کو ساقط کر دینا ہے "تجلی" نسبتِ اِلَی اللہ کا پالینا ہے۔ رباعی

برحق میری بات اور دعائی دعویٰ حق کا ہے راست میری ہر چیز ہے پرائی لِلّٰہِ الارضُ والسمٰوٰت
حسرت میرے پاس کیا دھرا ہے اک جان سو وہ بھی ہے پرائی

حسرت

توحید، فنا، تجلی تین طرح پر ہوتے ہیں۔ توحیدِ افعال۔ فنائے افعال۔ تجلیِ افعال۔ توحیدِ صفات۔ فنائے صفات۔ تجلیِ صفات۔ توحیدِ ذات، فنائے ذات، تجلیِ ذات۔

توحیدِ افعالی، فنائے افعالی، تجلیِ افعالی | سینما میں آدمی، جانور چلتے پھرتے، ناچتے، کودتے ہیں۔ کونسا کام ہے کہ وہ نہیں کرتے؟ کون سا امر ہے کہ سینما میں ہوتا معلوم نہیں ہوتا۔ اک جہانِ دیگر ہے کہ ہمارے آگے آگیا ہے۔

مگر ذی فہم کی نظر ایک نور پر پڑتی ہے۔ وہ تلاش کرتا ہے' کہ یہ نور کہاں سے آرہا ہے؟ پیچھے پلٹ کر دیکھتا ہے' تو ایک حجرے سے نور کا بقعہ ہے کہ نکل رہا ہے روشنی کی موج ہے' کہ آرہی ہے۔ اندر جا کر دیکھتا ہے تو ایک شخص تصویروں کے فلم پر روشنی ڈالتا ہے' اور ان کو جلد جلد چرخ دیتا ہے جس سے یہ تماشا سرتا تعجب ہوجاتا ہے ؎

تماشا گاہ ہے عالم کسی استادِ کامل کا — یہ ہم تم کیا ہیں گویا سینما کی چند تصویریں
حسرت حیدرآبادی

گراموفون کے ریکارڈ سے کیسے عمدہ ٹھمریاں' غزلیں' کیسے دلکش دُھرپد خیال۔ سُریلے راگ' راگنیاں سنائی دیتی ہیں۔ سارنگ' قُفل' ہارمونیم ستار۔ طاؤس۔ کمانچہ۔ طبلہ۔ ڈھولک کی آواز بھی آتی ہے۔ مگر صاحبِ عقل سمجھ لیتا ہے کہ یہ جمادہیں۔ یہ ان کی آوازیں نہیں۔ کسی خوش گلو قوال یا ماہرِ موسیقی کلاونت کے گلے کے کرشمے ہیں ؎

خشک تار و خشک چوب و خشک پوست — ازکجا می آید ایں آوازِ دوست

بانسری کی آواز سے بچہ خوش ہوتا ہے کہ اس میں سے کیا پیاری آواز نکل رہی ہے؟ مگر ہوشمند دیکھتا ہے' کہ اس میں بول رہا ہے کون؟

دو دہاں داریم گویا ہمچو نے — یک دہاں نہاں ست در لبہائے وے
مولانا روم علیہ الرحمۃ

چیونٹی دیکھتی ہے کہ قلم دوات میں ڈوبتا ہے۔ اور سفید کاغذ پر کیسے خوش وضع خوبصورت حروف لاکر جماتا ہے۔ قلم کیا ہے؟ حضرت سلیمان علیہ السّلام کے زمانے کا جن ہے۔ جو دریا میں غوطہ مار کر موتی، مونگا۔ جواہر۔ تعمیر کی چیزیں لاتا ہے۔ مگر جس کو خدائے تعالیٰ نے عقلِ سلیم دی ہے وہ خوب سمجھتا ہے کہ قلم، دوات، سیاہی، سب جمادات ہیں۔ ان میں بالذات حرکت کہاں؟ کوئی دوسرا ہی ہے جو ان کو متحرک کر رہا ہے۔

اسی طرح ممکنات میں سے کسی کی حرکت بالذات نہیں۔ تمام افعال کا خالق رب العالمین ہے۔ بندہ کرتا ہے۔ بندے کے کام کو خدائے تعالیٰ پیدا کرتا ہے۔ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ۔ کیونکہ فعل بھی ممکنات سے ہے ممکن بغیر واجب تعالیٰ کی وجود بخشی کے پیدا ہی کیونکر ہو سکتا ہے؟ بالعرض کا وجود بالذات کے بغیر محال ہے۔

لوگ دنیا میں، جو عالمِ اسباب ہے، اور بڑے امتحان کا مقام ہے نہایت غفلت ورزی کرتے ہیں۔ اس ممکن کو جو سلسلہ وجودِ ممکن میں پڑتا ہے، علت سمجھتے ہیں، اسباب میں خود کو جکڑ بند پاتے ہیں تو اپنے پر خدا کو بھی قیاس کرتے ہیں۔ اور اس کو بھی مجبور و ناچار سمجھتے ہیں کہ جب تک اسباب پورے

نہ ہوں۔ خدائے تعالیٰ بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ اسباب میں اس قدر منہمک ہیں کہ
مسبب ان کے پاس لفظِ بلا معنیٰ ہے۔ ممکن کا جانبِ وجود و عدم برابر ہوتا ہے
جانبِ وجود کو واجب تعالیٰ ترجیح دیتا ہے۔ ان کے پاس واجب کا وجود
و عدم دونو برابر ہیں۔ جو کچھ کرتا ہے بندہ کرتا ہے' خدا برائے نام ہے۔ فنائے
افعال کی وادی ایسی صعب و دشوار گذار ہے کہ اس میں چلنا کیا ہے؟ ایک
آفت کا سامنا ہے۔ اس دنگل میں فنائے ذات کے بڑے بڑے مدعی چاروں
شانے چت گرتے ہیں۔ اور پھر ان کا اٹھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسباب کا نظر سے
ساقط ہو جانا آسان بات نہیں۔ مربی کے دام سے نکل کر غیر مربی تک پہنچنا
کار سے دارد۔ توکل جس کی قرآن مبارک میں تاکید ہے۔ فنائے افعال ہے
تجلیِ افعال ہے۔ شرک فی الفعل سے بچنا ہے۔ تجلیِ فعلی کا ادراک ہے ایمان
رکھتے ہو تو خدا پر توکل کرو۔ وَعَلَى اللهِ فَتَوَكَّلُوا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ
توکل کرنے والوں کو خدا بس ہے۔ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ۔

تجلّیِ صفاتی

سفید گلاب کی ہلکی سرخی کیا لطف دیتی ہے۔ معمولی گلاب
کا رنگ کیا دلفریب ہوتا ہے۔ گلِ انار مشتعل آگ کے رنگ کو مات کرتا ہے
ترائی کا پھول آنکھوں میں چمک پیدا کرتا ہے۔ گیندے کا لباس جوشِ شباب سے

پارہ پارہ ہے۔ عنبر کوٹ جہانگیری کا مدعی ہے۔ جواہر پر غور کرو۔ الماس کی چمک دمک۔ یاقوت کی شعلہ انگیزی۔ پکھراج کی حیرت افزا زردی، زمرد کی نظر افزا سبزی۔ کیا بہتر منظر دکھاتی ہے۔ مگر ان میں سے کس کا رنگ اصلی ہے؟ کبھی نہیں، ہرگز نہیں؟ یہ تمام آفتابِ عالم تاب کے نور کے کرشمے ہیں۔ ان میں سے کسی کا رنگ حقیقی نہیں۔ آفتاب کے سات رنگ ہیں۔ جب نورِ آفتاب کسی پر پڑتا ہے تو بعض چیزیں بعض رنگوں کو پی جاتی ہیں اور بعض رنگوں کو منعکس و واپس کرتی ہیں۔ پھر انعکاسِ نور کے بھی درجات ہیں۔ اسی سے ہزار ہا قسم کے رنگ پیدا ہو گئے ہیں۔ سپید رنگ تمام شعاعوں کو واپس کرتا ہے۔ اور ساتوں رنگوں کو دکھاتا ہے۔ واہ رے سپید رنگ!!! سب رنگ تو تجھ میں ہیں اور تو بے رنگ کہلاتا ہے۔

سیاہ رنگ کسی شعاعِ شمسی کو منعکس و واپس نہیں کرتا ہے۔ وہ البتہ بے رنگ ہے، لوز وجود ہے، تو سیاہی عدم۔

اسی طرح اسماءِ الٰہیہ کا پرتو حقایقِ امکانیہ پر پڑتا ہے، تو بعض صفات کا ظہور ہوتا ہے اور بعض صفات کا ظہور نہیں ہوتا۔ ظہورِ اسماء و صفات بھی مختلف درجات پر ہے۔ اسی سے تو یہ سب دنیا کی رنگا رنگی قائم ہے۔

اگر سب سے صفاتِ الٰہیہ کا ظہور یکساں ہوتا تو یہ بوقلمونی کب رہتی؟ غرض کہ مخلوقات میں کوئی صفت اصلی نہیں۔ جو کچھ ہے، قیومِ حق کا ہے۔

مغرب ہوتی ہے تو راستوں پر بجلی کے گولے روشن ہو جاتے ہیں۔ اکثر تو سپید ہی ہوتے ہیں مگر بعض سبز، بعض سُرخ۔ بعض دودیا بھی ہوتے ہیں۔ جیسے گولے ہوں گے ان سے ویسی ہی روشنی پھیلیگی۔ امیروں کے گھروں میں بجلی کے جھاڑ کیا بہار دکھاتے ہیں۔ مکہ مسجد میں بارہ ربیع الاول کو جب روشنی ہوتی ہے تو مسجد ایک بقعۂ نور معلوم ہوتی ہے۔ مگر کوئی سچ کہے۔ کسی گولے میں کچھ نور ہے! یا ہے بھی تو کس کا نور اصلی ہے؟ ہرگز نہیں مخزن برق سے سارا نور تقسیم ہوتا ہے۔ جہاں مخزن میں کھٹکا کھلا۔ سارا حیدرآباد روشن، جہاں کھٹکا بند کر دیا گیا، تو تمام شہر تاریک۔

اسی طرح صفاتِ الٰہیہ سے تمام ممکنات کو امداد ہوتی ہے کس کی صفت کس کی طاقت کس کا زور اور کس کی قوّت، کون، انا لاغیری کا دعویٰ کر رہا ہے؟ دوسرے کے مال کو اپنا کہنا غصب ہے۔ خدائے تعالیٰ کے کمالات کو اپنا کہنا شرک ہے

دعویٰ حق کا ہے راست برحق   میری ہر بات اِدّعائی   حضرت حیدرآبادی

کُن سے سارا عالم یکُنْ ہو جاتا ہے۔ پھر قہرِ احدیت تمام عالم کو

نیست کر دیتا ہے۔ اور کوس لِمَنِ الْمُلْک بجا دیتی ہے۔ پھر شانِ رحمانیت تمام جہان کو کتمِ عدم سے ظاہر کر دیتی ہے۔ اور ہر ایک کو حسبِ استعداد و حوصلہ صفات سے بہرہ ور فرماتی ہے۔ اور بَل یَدَاہُ مَبْسُوطَتَان کا نغمہ سناتی ہے۔ ہر آن یہ سلسلۂ فنا، بقا جاری رہتا ہے۔ اس کو تجدّدِ امثال کہتے ہیں۔

اس تقریر سے معلوم ہو گیا کہ ہر آن و ہر لحظہ ہر ذرۂ کون کو قیّومِ ذُوالجَلَال کی طرف احتیاج ہے اور صرف اسی کی طرف احتیاج ہے نادان ہیں وہ جو حضرت جلّ مجدہٗ کے مقابل ممکن کو بھی موجود سمجھتے ہیں یا صفاتِ کمالیہ سے آراستہ یا اس کو کسی قسم کی قدرت سے متّصف جانتے ہیں۔ ممکن کا جو کچھ ہے بالعرض ہے۔ جب وجود ہی بالذات نہیں تو اور کیا چیز بالذات ہو گی؟ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّابِاللّٰہ۔ بندہ ہمیشہ سرفگند

اے ذاتِ تو مجمع الکمالات　　میں بھی ہوں کمالِ بے کمالی
حسرت حیدرآبادی

دیروز نہ بود، بود، نہ نمود و اکنوں نمو دیست بے بود۔ جامی رح

تو میرا خدا ہے میں ہوں تیرا بندہ　　حاجت مجھ میں ہے اور ہے تجھ میں غنا
جب ہے صفتِ ذات کا اظہار کمال　　میں مانگتا جاؤں اور تو دیتا جا
حسرت

باجہانِ ناپائیدار ساختی و سراب راپرآب تشناختی۔ درخواہش آں تاختی۔ نردِ زندگانی باختی۔ خردمند دل بجاویداں بندد۔ وباین وآن نہ پیوندد دلش از ہمہ گسستہ و باخدا پیوستہ ہ

حسرت میرے پاس کیا دھرا ہے ... اک جان سو وہ بھی ہے پرائی

جب بندے کو اپنے اور ماسوا اللہ کے افلاس۔ ناداری۔ احتیاج ذاتی۔ افتقارِ حقیقی کا علم ہوتا ہے تو سارا غرور کافور اور شرک دور ہو جاتا ہے اسمائِ الٰہیہ اس پر پرتو افگن معلوم ہوتے ہیں اور تجلّی اسمائی جلوہ فرما ہوتی ہے عام قاعدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جس نام کا ہو بار بار اعادہ کیا جاتا ہے تو اس پر اسی نام کی تجلّی ہوتی ہے۔ خواہ اس نام کو زبان سے کہیں یا دل میں خیال کریں جیسے جیسے اس اسم سے ربط زیادہ ہوتا جائے گا اس کے آثار بھی زیادہ نمایاں ہوتے جائیں گے۔ خدائے جلّ وعلا کی صفت ظاہر ہوتی جائے گی تو بندوں کی صفت مخفی ہوتی جائے گی جس قدر امر بالذات کرسیِ ظہور پر جلوہ گر ہوگا۔ شئے بالعرض کتمِ عدم میں نہاں ہوتی جائے گی۔ مخفی نہ رہے کہ جو شئے دوسرے سے قائم ہوگی اسے صفت کہتے ہیں۔ ذات مع الصفتہ اسم سے موسوم ہوتی ہے۔ مثلاً قدرت صفت ہے

جو خدائے تعالیٰ میں پائی جاتی ہے۔ قادر یا قدیر وہ ذات ہے جو صفتِ قدرت سے موصوف ہے۔ لہٰذا قادر یا قدیر اسماءِ الٰہیہ سے ہیں۔ اسی طرح رحم صفت ہے۔ رَحمٰن یا رَحِیم اسمِ الٰہی ہیں۔ اسماءِ الٰہی بسیط ہوتے ہیں۔ اور مرکب شئے۔ مثلاً حَیّ اسمِ بسیط ہے، اور خَالِقٌ اسمِ مرکب ہے۔ خالقیت پر غور کرو تو اس میں قدرت ضرور ہے۔ اس میں علم کا ہونا بھی یقینی ہے۔ حیات کے بغیر کوئی کام ہو نہیں سکتا۔ لہٰذا خالقیت میں ان کا ہونا بھی ضرور ہے۔ یہ تمام اسماء ایک دوسرے سے ممتاز ہیں۔ تو ذات سے بھی امتیاز رکھتے ہیں۔ خالقیت جدا چیز ہے۔ ربوبیت الگ وصف ہے۔ محی و ممیت بھی باہم امتیاز رکھتے ہیں یہ امتیاز ذات کے لحاظ سے نہیں ہیں یعنے ان کی ذاتیں جدا جدا نہیں ہیں۔ تمام اشیاء کی ایک ہی ذات ہے امتیاز مفہوم میں، اعتبار میں ہے۔ منشاء و مصداق سب کا ایک ذاتِ حق ہے۔ مشرکین ہر اسم کو مستقل سمجھتے ہیں، اور ہر کام کا ایک دیوتا یا رب سمجھتے ہیں جب ان سے کہا گیا کہ یہ اسماءِ حسنیٰ کو تم دیوتا و مستقل سمجھتے ہو خدا سے جدا نہیں، بلکہ اسی ذاتِ حقہ کے گوناگوں نام ہیں۔ تو ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ اور کہنے لگے اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا

لِکُلِّ شَیءٍ عُجَابٌ کیا تمام دیوتاؤں کو غیر مستقل اور ایک ذات کے مختلف نام بتا کر لاکھوں دیوتاؤں اور دیبیوں کو ایک ہی خدا بتایا گیا ہے؟ یہ توبڑی تعجب خیز بات ہے! بالجملہ جب خدائے تعالیٰ کے افعال کا ظہور ہوتا ہے تو بندوں کے افعال کالعدم ہو جاتے ہیں۔ خدائے تعالیٰ کے انوارِ کمالات تاباں ہوتے ہیں تو بندوں کے ابرہائے اوصاف پارہ پارہ ہو کر فنا ہو جاتے ہیں۔

تجلّیِ ذات واہ رے آم! تیرا کیا کہنا! تیرا رنگ دلچسپ۔ تیری خوشبو دلکش۔ تیرا اثر دلفریب۔ بچے تجھ پر جان دیتے ہیں۔ جوان تجھ پر مال لٹاتے ہیں۔ بڈھوں کے حق میں تو ماں سے کم نہیں۔ بچپن میں دانت نہ تھے تو ماں کے پستان چوستے تھے۔ بڑھاپے میں دانت نہیں ہیں تو تجھے چوستے ہیں۔ اور تیرے رس کو شیرِ مادر جانتے ہیں۔ زرلقت کی تھیلی میں خدا نے دودھ، ملائی شکر زعفران کو جما کر قفلی لگا دی ہے۔ سچ پوچھو تو یہ تشبیہ بھی تجھ پر پوری صادق نہیں آتی۔ تو کہاں اور یہ مصنوعی مرکب کہاں؟ پھر کتنے اقسام۔ کس قدر انواع و اجناس۔ اَعَزُّ الثَّمَر۔ مرغوبہ۔ الفن۔ نواب پسند۔ دل پسند۔ قادر پسند۔ گوا۔ بے نشان۔ سیندوری۔ پری۔ ہر شہر میں جدا رنگ، جدا شکل۔

جدا مزا۔ جدا خوشبو۔ مگر سب ہیں آم ہی۔

واہ رے آم تیرے اتنے نور رنگ۔ اتنے تو مزے۔ مگر یہ کیا ظلم ہے؟ قدیم فلسفی تجھے حقیقی حقیقت نہیں مانتے۔ آب۔ آتش۔ خاک باد کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔ بعض ہیولےٰ وصورت کے اقتران کو تجھے سمجھتے ہیں۔ کیا آج کل کیمیا دانوں کی بھی عقل ماری گئی ہے۔ وہ بھی تجھے اعتباری ماہیت سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بیانوے ۹۲ عناصر میں سے چند کے مجموعہ کا نام تو ہے۔ بعض تجھے چند دقائق کا مجموعہ سمجھتے ہیں بعض مادّے کی صورتوں میں سے ایک صورت تجھے بھی جانتے ہیں۔ بعض ایتھر کے کرشموں میں سے تجھے بھی ایک کرشمہ جانتے ہیں۔ صوفیہ صافیہ باریک بین، دقیقہ شناس ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ اسماء وصفاتِ الٰہیہ کی نسبت خاص جس علم یعنے عینِ ثابت کے مطابق اقتران کرنیکا نام یا عینِ ثابت پر صفاتِ الٰہیہ کے پرتو پڑنے کا نام مخلوق۔ بندہ۔ ممکن۔ موجودِ اعتباری یا وہمی رکھتے ہیں۔ مگر یہاں اعتباری یا وہمی کے معنے اثبابِ اغوال۔ یا کھوبات کے دانت نہیں ہیں بلکہ جس طرح آم اعتباری حقیقی ہے۔ اسی طرح دوسری تمام چیزیں اعتباری حقیقی ہیں۔ پس خدائے تعالیٰ کی ذات تو حقیقی و تمام دیگر حقائق و ذوات اعتباری ہیں۔ اس مسئلہ میں ذرا غور کرو کہ وجود کے مقابل

کوئی شئے ہے؟ عدم ہے۔ عدم بھی بھلا پایا جا سکتا ہے؟ پایا جائے تو عدم کیونکر ہو؟ وہ تو وجود ہو جائے۔ وجود، ذاتِ واجب جل مجدہٗ سے علیحدہ و زائد کوئی چیز نہیں۔ جب وجودؔ واجب کا عینِ ذات ہو تو ممکن کے لئے کیا رہا؟ وہی عدم، وہی نیستی، وہی افتقار۔ بلکہ ممکن بھی کہاں رہا؟ خیر یہ تو منطقی دلائل ہیں ہم کو ان سے اس وقت کوئی بحث نہیں۔ اتنا تو ہر شخص سمجھتا ہے کہ خدائے تعالیٰ بذاتہٖ کامل ہے۔ اس کا کمال اس کی ذات کے سوا دوسرے امر سے نہ ہونا چاہیئے۔ نیز خدائے تعالیٰ وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ کسی کی مقدور ہے کہ اس کے سامنے کسی بات کا دعویٰ کرے۔ دعویٰ تو جب ہوتا کہ اس کا کوئی حقیقی و بالذات وجود ہوتا۔ جس کی ذات واہیات ہو اس کا دعویٰ کمال خرافات نہ ہوگا تو کیا ہوگا؟ ایاز قدر خود بشناس ؎

زعمِ باطل کی تجھ کو مستی کب تک ... ناداں یہ ادعائے ہستی کب تک

تو بھی موجود اور حق بھی موجود ... ظالم یہ شرک و خود پرستی کب تک

حسرتؔ موہانی

تجلیِ صفات تک تو سمجھتا تھا کہ میں ہوں۔ مگر میرے اوصاف اصلی نہیں حقیقی اوصاف خدائے تعالیٰ کے ہیں۔ خدا کے اوصاف میری طرف

نسبت پاکر مجھ سے علاقہ پیدا کر کے میرے سمجھے جاتے ہیں جب تجلّیِ ذاتی ہوتی ہے تو اُس کی ذات بھی نیست و نابود ہو جاتی ہے۔ اس وقت ذوالجلال والاکرام ندا دیتا ہے لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْم ؟ جواب دینے والا ندارد۔ خود اپنے آپ جواب دیتا ہے۔ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّار۔ یہ حالت موت سے مشابہ ہے بلکہ اس سے زیادہ ہے۔ موت میں ناسوت سے بے خبری یا بے تعلقی ہوتی ہے۔ اس کا تو کسی عالم میں پتہ نہیں ملتا ؎

ہم نے تو لاکھ ڈھونڈا کچھ بھی پتہ نہ پایا ۔۔۔ مجنوں کدھر چھپا ہے لیلیٰ تیری گلی میں
دیکھا تو کچھ نہ پایا سوچا تو بس یہ سمجھا ۔۔۔ اِک نام رہ گیا ہے میرا تیری گلی میں

(حسرت حیدرآبادی)

بیخودی و بیہوشی تو اکثر بیماریوں اور صدمات میں بھی ہو جاتی ہے۔ پھر تجلّیِ ذاتی یا فنا کو اس سے امتیاز کیا ہے؟ بات یہ ہے کہ بیہوشی میں جہل و غفلت رہتی ہے۔ یہاں سراپا علم و معرفت ہے۔ وہ ظلمت ہے، یہ نور ہے۔ وہ رنج ہے، یہ راحت ہے۔ وہ تکلیف ہے، یہ لذت ہے ؎

لطفِ مے تجھ سے کیا کہوں زاہد ۔۔۔ ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں
گم شدن در گم شدن دینِ من است ۔۔۔ نیستی در ہستی آئینِ من است

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ

تو حق ہے۔ تیرے سوائے جو کچھ ہے باطل ہے۔ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ مَّا خَلَا اللّٰہُ بَاطِلٌ جو نسبت حق و باطل میں ہے وہ باہم باطلوں میں کہاں؟ الفاظ انہیں معانی کے لئے موزوں ہیں جو محسوس بحواسِ ظاہری یا باطنی ہیں یا کسی قسم کا ادراک ان کو احاطہ کرتا ہے تو محیط ہے۔ محاط ہونے سے پاک ہے لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ کمندِ فکرِ سلیم تیری عظمت کے کنگرے تک پہنچنے سے کوتاہ ہے۔ اور سمندِ عقلِ مستقیم میدانِ تحقیقِ حقیقت میں گمراہ ہے۔ مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ ۔ دریائے کُنہِ حقیقت میں کسی کا تھل بیڑہ نہیں لگتا۔ یہاں ڈوب کر پاش پاش ہو جانا ہی تیرنا ہے۔ یہاں تلاش میں کھو جانا ہی پانا ہے ؎

جستجو میں ان کی ہم خود کھو گئے　　چاہتے کیا تھے مگر کیا ہو گئے
(حسرت حیدرآبادی)

اَلْعِجْزُ عَنْ دَرْكِ الْاِدْرَاكِ اِدْرَاكٌ پھر بھی میں تجھے سمجھوں تو کیونکر؟ ڈھونڈوں تو کدھر؟ تو زماں سے پاک ہے، مکان سے پاک ہے نہ تیرا کوئی شبیہ ہے نہ مثل ہے، نہ نظیر ہے۔

صنّاع و ساعت | کیا بجا ہے؟ سب کچھ بج گئے ہیں۔ شاید بارہ بجے
ہیں۔ جی ہاں۔ ذرا دینا آپ کی گھڑی دیکھوں، کیسی ہے؟ کس کارخانہ
کی ہے؟ ہیڈ و ماسن پیٹنٹ ہشت روزہ گھڑی ہی کو پسند کرتا ہوں۔ جمعہ کی
نماز کو جاتے ہوئے کو نجی دیدی اور بے فکر۔ متفشر فرنگی، بھی مادّی کاموں
میں عِفْرِیتٌ مِنَ الْجِنّ سے کم نہیں۔ کیا اچھی گھڑی ہے؟ آئینہ کیا صاف ہے
کیا عمدہ کیس ہے؟ کیا نفیس ڈائیل ہے؟ گھنٹے کی سوئی ہے، منٹ کی
سوئی ہے۔ سکنڈ کی سوئی کے عوض کسی عاشقِ ناشاد کی طرح سینہ چاک،
دلِ پُر اضطراب ہے۔ گھڑی کے اجزا، کیا درست؟ نظامِ ترتیب عمدہ
کہ کو نجی دیدی اور تمام پُرزے کام پر لگ گئے۔ کوئی پُرزہ بیکار نہیں۔
کمانی اور چکّر تو کیا؟ کتہ بھی بیکار نہیں ہے۔ کیا خلّاقِ عالم، عالم سے ایسی
ہی نسبت رکھتا ہے؟ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ۔ کاریگر کا صرف اتنا کام ہے کہ
دھات اور فلزّات کے ٹکڑوں کو لیکر پگھلا کر، ڈھال کر یا پیٹ پاٹ کر
ریت رات کر ترتیبِ خاص سے اس کو جوڑے۔ ذرا وہ فلز کے ایک ذرّے
کو تو پیدا کرلے؟ پھر گھڑی اپنے بننے تک صنّاع کی محتاج تھی۔ مگر اب وہ
محتاج کہاں؟ گھڑی ساز مر بھی جائے تو وہ باقی رہے گی۔ یہاں ہر آن

امدادِ وجود ہے۔ ہر لحظہ احتیاج ہے۔ ایک لمحہ قیوّمِ حق کی توجہ نہ رہے تو عالم
کہاں اور اُس کی نمایش کدھر؟

عنکبوت و نسیجِ العنکبوت ذرا! مکڑی کے جالے کو دیکھنا۔ کیا باقاعدہ منتظم طریقہ پر بنا ہے؟ کیا باریک نازک تار ہے؟ ایک بال کے ہزارویں بلکہ لاکھویں حصّے سے بھی کم ہے۔ باوجود اتنے مہین ہونے کے مکھیوں بھُنگوں کے پکڑنے میں کام دیتا ہے۔ یہ کس چیز سے بنا ہے؟ مکڑی کے جسم سے ایک لیس دار لُعاب نکلتا ہے۔ اس سے بنا ہے۔ کیا عالم بھی اسی طرح بنا ہے؟
خدائے تعالیٰ نے اپنے میں سے کوئی چیز نکالکر بنایا ہے؟ اَستَغفِرُاللّٰہَ العَظِیم
مکڑی مرجاتی ہے اور اس کا جالا اس کے بغیر باقی رہتا ہے۔ مگر یہاں اک آن
امدادِ وجود موقوف ہوجائے تو عالم درہم برہم ہوجائے۔ نہ تم رہیں نہ ہم۔ نہ
زمین رہے نہ آسمان۔ ایک ہُو کا سماں رہ جائے۔ سارا عیاں نہاں ہوجائے۔
موجود مفقود ہوجائے۔ عالم عدم ہوجائے۔

تخم و شجر زمین میں تخم کو بوتے ہیں۔ بیچارہ چند روز زمین کی تاریکی یا پانی کی تری، آفتاب کی گرمی پر صبر کرتا ہے پھر اپنے پوست کے برقعے کو پھاڑتا ہے اور کونپل بنکر سبز نکالتا ہے۔ بڑھتا بڑھتا زمین میں سے باہر نکل آتا ہے۔

پھر پتے نکلتے ہیں شاخیں پھوٹتی ہیں پھر بڑھتا ہے اور بڑھتا ہے اور پورا درخت نبکر راہ رو کو سایہ کھانے والوں کو پھل، سونگنے والوں کو پھول۔ بیمار کو جڑیں چھال وغیرہ۔ قسم قسم کے طالبوں کو انواع و اصناف کا فائدہ دیتا ہے۔ سوکھ جاتا ہے تو لکڑی بن جاتا ہے۔ گھروں کے لئے تیر، شہتیر، کلچیان دروازے۔ فرنیچر کے لئے میز کرسیاں، تخت چوکیاں۔ بالجملہ ہر طرح سے کام دیتا ہے۔

ذرا تخم و درخت پر غور کرو۔ درخت میں جتنی چیزیں ہیں، ان میں سے کیا چیز تخم میں نہ تھی؟ درخت میں تفصیلاً ہیں۔ تخم میں اجمالاً تھیں۔ پہلے نہاں تھیں، اب عیاں ہو گئی ہیں۔ ذرا یہ بھی تو بولو کیا جڑیں تنہ ہیں؟ یا پتے، ڈالیاں، یا پھل، پھول۔ کیا پھل کا کام پھول سے لے سکتے ہیں؟ یا جڑ کا کام پتے سے، یہ کیا حماقت ہے؟ بڑی ہی بد تمیزی ہو گی، اگر کوئی آم کو املی سمجھے۔ یا کچلے کو جدوار۔ کوئی کچلے کو جدوار کہہ کر کھا تو لے، پھر اس کا مزہ چکھے۔

اسی طرح گو وجود بسیط ہے۔ ایک ہے، مگر وہی ہژدہ ہزار عالم میں جلوہ گر ہے۔ باطن ہی ظاہر ہو گیا ہے۔ واحد ہی کثیر بن گیا ہے۔ تفصیل کا مرجع اجمال ہی ہے۔ کثرت کا منبع وحدت ہی ہے۔ مگر نہ وحدت کثرت ہے،

نہ کثرت وحدت سے

توہم ہے توہم ہے نہ قلت ہے نہ کثرت ‏ ‏ ‏ ‏ نہ سمجھیں یہ تو حیرت ہے جو سمجھیں یہ تو حیرت ہے

حسرت حیدرآبادی

مگر اس مثال پر کوئی غور کرے۔ پانی حرارتِ شمس۔ مٹی، کوئلے کی ہوا (کاربانک ایسڈ گیاس) جس کو انسان تنفس سے خارج کرتا ہے۔ وہی درخت کی غذا بن کر اس کو بڑھاتے ہیں۔ نشوونما دیتے ہیں۔ یہاں وجود کے سوا ہے کیا؟ جو آکر ملے اور عالم بنے۔ درخت میں تخم کا استحالہ ہوگیا ہے۔ اب تخم کہاں ہے؟ وہ تو بے نشان ہوگیا۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ اَسْتَغْفِرُاللّٰہ۔

کیا خدا عالم بن کر نیست و نابود ہوگیا ہے؟ یا بے پتہ ہوگیا ہے؟ وہ اَلْاٰنَ کَمَا کَانَ ہے۔ وہاں نیستی کو راہ نہیں۔ استحالے کو گذر نہیں، عدم کو قدم نہیں سے

توجزوی وحق کل است گر روزے چند ‏ ‏ ‏ ‏ اندیشۂ کُل پیشہ کنی کُل باشی

جامی علیہ الرحمتہ

جُزو کُل | میں کُل ہوں۔ اعضاء میرے اجزاء ہیں۔ آنکھ، ناک، ہاتھ، پاؤں کونسا جزء ہے جو مجھ سے جدا ہے؟ کوئی نہیں۔ اعلیٰ بھی میرا ہے، اسفل بھی میرا آنکھ کان، دوسرے اعضاء سے افضل ہیں۔ دل و دماغ جگر و معدہ بقیہ اعضاء اندرونی کے رئیس ہیں۔ یہ اضافی افضلیت یا مقبولیت مجھ پر کیا اثر کرسکتی ہے؟

میں نہ کسی افضلیت سے افضل ہوں ۔ نہ مفضولیت سے مفضول ۔ میرا افضل ذاتی ہے نہ کہ اضافی ۔ سب میں میں ہوں اور سب سے جدا ہوں ۔ مگر کوئی یہ کہے کیا انتفاء جز سے انتفاء کل لازم نہیں آتا ؟ مگر یہاں تو علویات و سفلیات نیست و نابود ہو جائیں ۔ فنا میں روپوش ہو جائیں ۔ اس سے ذاتِ کاملہ حقہ کی ازلیت و ابدیت پر ذرا اثر نہیں پڑتا ۔ اس کا کمال لایزال ہے ۔ وہ

اَلْاٰنَ کَمَا کَانَ ہے ۔

کُلّی جزی | انسان مثلاً کُلّی ہے ۔ اور زید و عمر و بکر اس کے جزئیات ہیں ۔ عورت مرد اصناف ہیں ۔ اب ذرا بولو انسان عورت ہے یا مرد ؟ عورت ہونا ، مرد ہونا کوئی بھی انسان ہونے میں داخل نہیں ۔ قوام حقیقت انسان میں نہ عورت ہونا داخل ہے نہ مرد ہونا ۔ باوجودیکہ عورت یا مرد انسان ہی ہے ۔ انسان نسل کے لحاظ سے حامی ۔ سامی ۔ یافثی ہے ۔ اقلیم کے لحاظ سے ایشیائی ۔ یورپی افریقی ۔ امریکی ہے ۔ مذہب کے اعتبار سے مسلمان ، نصرانی ، یہودی ، بودھی ہندو ، مجوسی ہے ۔ غرضکہ کُل ہزارہا قیود میں پایا جاتا ہے ، وہ خود فی نفسہ ان قیود سے آزاد ہے ۔

اسی طرح عالم میں تمام جلوے وجود ہی کے ہیں ۔ مگر وہ خود ان تعینات سے

پاک ہے۔ وہ آزادی و اطلاق پر ہے وہ اپنی صرافت ذاتی و محوضت اصلی پر متغیر نہیں ہوا۔ تبدل کو اس کے ساحت تک رسائی نہیں۔ احتیاج اس کی آستان تک پہنچ نہیں سکتی۔

مگر اس مثال پر تامل کرو۔ کلی اپنی جزئیات کی طرف کیا محتاج نہیں؟ کیا احتیاج شانِ امکان نہیں؟ کیوں نہیں؟ مَا لَمْ یَتَشَخَّصْ لَمْ یُوْجَدْ۔ یعنے کوئی مبہم و مطلق شئی نہیں پائی جاتی متعین ہوتی ہے تو لباسِ وجود میں نمودار ہوتی۔ یہاں وجودِ حقیقی۔ ذاتِ سامی سمات۔ جزئی حقیقی ہے۔ بالذات موجود ہے اس کے سوا جو ہے بے بود ہے۔ دوسروں کی موجودیت اس سے ہے۔ وجودِ حقیقی اپنے وجود میں جو اس کا ذاتی بلکہ عین ذات ہے۔ دوسروں کا محتاج نہیں۔ اگر وجودِ حقیقی کلی اور موجودات اس کے جزئیات ہوں۔ تو وجود کا دوسرے کی طرف یعنے تشخص و تعین کی طرف احتیاج لازم آتی ہے۔ تَعَالَی اللّٰہُ عَمَّا یَصِفُوْن

یہ سب روپ تیرے تو بہروپیا ہے تو ہر رنگ میں رہ کے سب سے جدا ہے
حضرت سعید آبادی

ہیولیٰ و صورت ہیولیٰ۔ اور مادّے کی کرشمہ سازی و عجائب طرازی تو دیکھو۔ جھاڑ وہ، پہاڑ وہ حیوان وہ، انسان وہ کہیں کالا ہے اور کہیں گورا ہے۔ کہیں چھوٹا ہے، کہیں بڑا ہے۔ کہیں عجز و مسکنت ہے،

کہیں جلالت و اُبہت ہے ۔ مرد بنکر شجاعت و قوت ۔ عورت بنکر حسن و نزاکت کہیں عابدِ خوش آئیں، کہیں زاہدِ پرتمکیں ۔ کہیں رندِ سبوکش، کہیں ساقیِ ماہوشں لاکھوں شکلیں بدلیں ۔ لاکھوں شکلوں میں اب ہے ۔ لاکھوں شکلیں بدلیگا ۔ مگر پھر بھی جوں کا توں ہے، جو پہلے تھا وہ اب بھی ہے اسی طرح وجودِ حقیقی ہیولائے کل ہے ۔ مادّہ اصل علویات و سفلیات ہے ۔ تمام مواد کی اصل ہے مگر کوئی اس مثال پر غور کرے ۔ ہیولی حکماءِ قدیم کے پاس بالقوہ ہی بالقوہ ہے اس کو فعلیت کی بو تک نہیں پہنچتی ۔ صورت اس کے وجود کی علت ہے ۔

پس خدائے تعالیٰ اور معلولیت؟ اَسْتَغْفِرُ اللہ! اَسْتَغْفِرُ اللہ!

اُسے معلول تو کیا، علت العلل کہنا بھی غلط ہے ۔ علیت اسی پر منحصر ہے، دوسرا کون علت ہو سکتا ہے؟ جو کچھ ہے اسی کا ہے ۔ افلاس، امکان کا خاصہ ہے ناداری، بندگی کا لازمہ ہے ۔ حکمائے جدید کے پاس مادّے کے خواص یہ ہیں تحیز (جگہ گھیرنا) مسامیت (مسام و سوراخ دار ہونا) وزن ۔ انقسام ۔ (تقسیم قبول کرنا) استمرار (ایک حال پر رہنا، ساکن تو ہمیشہ ساکن جب تک کوئی اُسے متحرک نہ کرے ۔ متحرک تو ہمیشہ متحرک جب تک کوئی اُسے ساکن نہ کرے) یہ بے ارادہ، یہ متاثر و منفعل ہونے والا مادّہ عاجز ہے ۔ عاجز مردہ ہے ۔

مردہ جاہل ہے۔ جاہل، یہ مردہ پرستی کب تک؟ جو تمہارے زیرِ اثر ہو وہ تمہارا بندہ ہے۔ اپنے بندے کو اپنا خدا سمجھتے ہو۔ کیا دوں ہمت ہو؟ کیا پست خیال ہو؟ خدائے تعالیٰ کی طرف انفعال کی نسبت کرنے سے تمھیں کچھ انفعال نہیں ہوتا توبہ! توبہ!! اس علم سے جہالت بہتر۔ اس حکمت سے سفاہت خوشتر۔

پنبہ وجامہ | کپڑا کس سے بنتا ہے؟ روئی سے یا اون وریشم سے۔ بتایا عمامہ، کرتہ، پائجامہ۔ یا شیروانی قمیص۔ ویسٹ کوٹ پتلون کس کے ظہور ہیں؟ روئی کے۔ چولی کرتہ، دوپٹہ، ساڑی قمیص، جاکٹ، فراک کس کی نمائشیں ہیں؟ وہی روئی یا ریشم کی۔ کیا شیروانی مستقل وجود رکھتی ہے؟ نہیں شیروانی کی ہیئت کس میں ہے؟ روئی میں۔ روئی کہاں ہے؟ شیروانی میں۔ کیا شیروانی روئی ہے؟ یا روئی شیروانی؟ نہیں کوئی نہیں۔ روئی میں مختلف صورتوں میں ظہور کرنے کی صلاحیت ہے۔ شیروانی ان میں سے ایک ظہور ہے۔

مولانا صاحب کے روبرو کوٹ پتلون آتے ہیں۔ تو مَنْ تَشَبَّہَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ فرما کر کس طرح دور دور رہتے ہیں۔ اسی طرح کسی مصنوعی جنٹلمن کے نزدیک شایا۔ عمامہ تو "لاؤ۔ دیکھو" "اولڈ" فیشن یا "میاڈ ملاؤں کا ڈریس کہہ کر

کیسے فرمائشی قہقہے لگاتا ہے ۔ ان میں سے کسی ایک کی طرف ساڑھی چولی تو بڑھاؤ ۔ کیا کوئی پہننے کے لئے تیار ہوگا؟ ہرگز نہیں ۔ باوجودیکہ یہ سب روئی ہی کے تعینات ہیں اور اسی کی نمائشیں ہیں ۔ اسی طرح وجود میں مختلف صورتیں نمودار ہونے کی استعداد تھی ۔ عالم اس میں سے ایک ہے ۔ یہ زنگارنگی اسی کے ظہور کی ہے ۔ مگر اس مثال میں غور کرو ۔ روئی میں کپڑے کی صورت، شیروانی کی ہیئت کا حال ہے ۔ کپڑے کے دو ٹکڑے کردو ۔ روئی کے بھی دو حصے ہوجائینگے یعنی انقسامِ حال سے انقسامِ محل لازم آتا ہے ۔ یہاں ہژدہ ہزار عالم ہر آن ہر لحظہ کتمِ عدم سے منصّۂ وجود پر ظہور کرتے ہیں ۔ پھر ظہور سے بطون کی طرف رجوع کرتے ہیں ۔ مگر حقیقتِ حقہ کا دامنِ کمال، وصمتِ زوال اور داغ سے پاک ہے ۔ سُبْحَانَ اللّٰہِ عَمَّا یَصِفُوْن ۔

موجِ دریا

زدریا موجِ گوناگون برآمد ؛ ز بے چونی برنگِ چون برآمد

موج دریا پر قائم ہیں ۔ اور اس کے محتاج ۔ اگر دریا نہ ہو تو موج بے حقیقت دریا سے موجیں اٹھتی ہیں ۔ کوئی چھوٹی ہوتی ہے کوئی بڑی، بڑی موج، چھوٹی موج کو نگل جاتی ہے ۔ کشتیوں کو پارہ پارہ کردیتی ہے ۔ کوہ پیکر جہازوں کے سامنے سدّ سکندری بنکر کھڑی ہوتی ہیں ۔ یہ موجیں کہاں تھیں؟ دریا میں ۔ پھر کہاں چلی جائینگی

دریامیں۔ کیا موجوں کے حدوث سے دریا کا حدوث لازم آتا ہے؟ نہیں موجوں میں تغیر و تبدل ہوتا ہے۔ دریا جوں کا توں ہے۔ موج لاکھ سر اٹھا اٹھا کر دعوائے وجود کرے مگر وہ پایر ہوا ہے۔ اور اس کا دعویٰ جھوٹا ہے۔ کہاں وجود بالذات، کہاں وجود بالغیر؟ اسی طرح عالم اور عالم میں جو کچھ ہے سب وجود کا نمونہ ہے۔ ظہور عالم حادث ہے، وجود حق قدیم۔ عالم وجود حقیقی کا محتاج ہے اور وجود حقہ محتاج الیہ۔ یہ تمثیل بھی ذات حق پر من کل الوجوہ منطبق نہیں۔ دریا کل ہے، موج جزو۔ انتفاء جزو سے انتفاء کل لازم آتا ہے۔ ہوا جو غیر دریا ہے، اگر ملتی ہے تو موج نمودار ہوتی ہے۔ برودت کار ہوتی ہے۔ یہاں وجود حقیقی کے سوا ہے کیا شئی جو آکر ملے اور سب کچھ ہے۔ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَکَ۔

مرآت و عکس و شخص

مرآت حقائق ہے یہ دنیا میرے آگے	ہر ایک میں ہے یار کا جلوہ میرے آگے
نیرنگی اشکال ہے نیرنگ مرآیا	سو رنگ میں ہے ایک ہی جلوہ میرے آگے

حسرت حیدرآبادی

آئینۂ اعیان و مرآت حقائق میں وجود حقیقی کی جلوہ گری ہے۔ آئینہ خانہ میں جاؤ تو تم کو ایک عجیب تماشا نظر آئے گا۔ یا تو تم ایک تھے یا جتنے آئینے ہیں اتنے ہی تم ہو گئے ہو۔ پھر کہیں بڑے آئینہ میں بڑے، چھوٹے میں چھوٹے صاف میں صاف

دھندلے میں دھندلے۔ لافنگ گیالری یعنے ہنسی کے کمرہ میں تو اس سے بھی زیادہ عجیب تماشا ہوتا ہے کہیں پست قد، بزرگ شکم کہیں دراز قامت لاغر اندام کہیں سر نیچے ٹانگیں اوپر، کہیں کچھ کہیں کچھ۔ اس کو بھی چھوڑو۔ مرآۃ نبی اگالدان لو اور اس کو کبھی سیدھا رکھو، کبھی ترچھا۔ وہ لافنگ گیالری سے کیا کم ہے؟ میں خود کو دیکھتا ہوں اور خود ہی پر ہنستا ہوں۔ واہ رے میں! ایسی شکلیں بدلتا ہوں اور پھر جوں کا توں ہی ہوں۔ یہ نیرنگیاں جب ہی تک ہیں کہ تم آئینے کے مقابل ہو۔ سامنے سے ہٹ جاؤ، تو پھر نہ یہ خیالی کثرت ہے نہ ظہور کی جدت۔ اگر آئینہ کو وجود سمجھو اور شخص کو عین تو آئینہ بالذات مرئی ہے وہی شہود سے بری ہے آنکھوں سے مخفی ہے۔ واہ رے آئینے! تیری صفائی دوسرے کو تو دکھا دیا اور خود چھپ گیا۔ گویا آئینہ نظر نہ آئے گا؟ مگر تھوڑی کوشش تو کرو اور صورتوں کو نہ دیکھو۔ آخر میں ہار مان لیں گے عجز کا اعتراف کریں گے مگر کوئی سچ کہے، آئینہ تو شخص کا غیر ہے یہاں وجود کا عبر کیا ہے جو مرآت بنے خود ہی شخص ہے خود ہی عکس ہے۔ پھر نہ آئینہ شخص ہے، نہ شخص عکس ہے۔ نہ اس کا بالعکس ہے ؎

وحدت میں تیری حرف دوئی کا نہ آسکے
آئینہ کیا مجال جو صورت دکھا سکے

یا اللہ تیری کنہ کے ادراک میں شہباز بلند پروازِ فکرِ سلیم پر و بال شکستہ ہے۔ اور تیری معرفت کے سنگستان میں توسنِ عقلِ قدیم سکندری خوردہ۔ تجھے کوئی نہیں جانتا تو پھر میں کس کو مانتا ہوں؟ تو پوشیدہ ہے تو تجھ کو کس نے چھپایا؟ تو عیاں ہے تو پھر کہاں ہے؟ اگر تو عرش پر ہے تو بال و پر دے کہ اُڑ کر تجھ تک پہنچوں۔ اگر تو قریب ہے تو آنکھ دے کہ تجھے دیکھ سکوں۔ اگر تو میرے دل میں ہے تو برق رو بنا دے کہ اپنے آپ میں گھسوں اور تجھے پاؤں۔ اگر تو نہیں مل سکتا تو ہم کو یہ فطرتاً طلب کیسی؟ اگر خدا کا بندے سے ملنے کا قاعدہ نہیں تو میں اپنے سے بیزار ہوں۔ مرنے کو تیار ہوں۔ مگر میں جلوں گا تو میرا دھواں عرش تک پہنچے گا۔ خاک ہو جاؤں گا تو بگولہ بن کر اڑوں گا اور تیرے دامن تک پہنچوں گا۔ مجھے صفحۂ ہستیِ وہمی سے محو و محق کر دے۔ طلس و طمس نہس نہس کر دے۔ نہ میں رہوں نہ یہ آفت سہوں۔ بس بس میں اسی میں شاد ہوں۔ کہ میں مردہ رہوں۔ میرا مقصود زندہ رہے۔ میں نابود رہوں میرا محبوب موجود رہے ؎

ٹوٹے یہ طلسمِ وہم میرا
آئینۂ دل بنے مصفا

فانی کا فنا ہی ہونا اولیٰ
باقی کی بقا ہے سب سے اعلیٰ

حسرتؔ حیدرآبادی

پیوندِ خاک ہوگا، نقشِ قدم تیرے گا۔
حسرتؔ یہ جان ہی کر آیا تری گلی میں

حسرتؔ حیدرآبادی
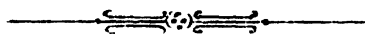
لطائف

بزرگان دین کے اقوال میں قلب۔ نفس۔ روح۔ سر۔ خفی۔ اخفی کے الفاظ بکثرت مستعمل اور اس قدر مختلف معانی میں مستعمل ہوتے ہیں۔ کہ تعین معنی مشکل۔ ان کے مقام بتانے میں بھی کچھ کم اختلاف نہیں۔ حضرت شیخ احمد فاروقی سرہندی کے قول کے مطابق قلب پستان چپ کے دو انگشت نیچے ہے۔ تجلیات افعالیہ اس سے متعلق ہیں۔ آدم علیہ السلام کے زیر قدم ہے۔ جس کا قلب ذاکر ہو وہ آدمی المشرب کہلاتا ہے۔ قلب کا نور زرد رنگ کا ہے۔

روح۔ پستان راست کے دو انگشت نیچے متعلق صفات ثبوتیہ تحتِ قدمِ ابراہیم علیہ السلام ہے۔ رنگ نور سُرخ ہے۔

سر۔ قلب سے دو انگشت اوپر مائل بجانب وسط۔ متعلق تجلیات شیون ذاتیہ۔ رنگ نور سفید۔ تحت قدم موسیٰ علیہ السلام۔

خفی۔ روح سے دو انگشت اوپر مائل بجانب وسط۔ متعلق صفات ربانیہ۔ رنگ نور سیاہ و تحت قدم عیسیٰ علیہ السلام۔

اخفیٰ ۔ وسط سر متعلق شان جامع یعنے الوہیت ۔ رنگ سبز ۔ تحت قدم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم ۔

نفس ۔ ان سب لطائف کی مجموعی حالت کا نام ہے ۔ حضرت سید آدم بنوری کے اقوال کے مطابق قلب کی جگہ وہی ہے جو دل کی ہے اس کے نور کا رنگ سرخ ہے ۔ روح اس کا محل جگر ہے ۔ یعنے جانب راست ۔ رنگِ نور روح سپید ہے ۔ نفس کا کستر گون بمقام ناف ۔ خفی بمقام پیشانی سیاہ رنگ سر ۔ شش یعنے وسط سینہ سے ذرا بلند ۔ رنگ سبز ۔ اخفیٰ ۔ وسطِ سر ۔ اُمِ دماغ بے رنگ ۔

حجت الاسلام غزالی کے قول کا حاصل یہ معلوم ہوتا ہے کہ دل یا قلب سے قوتِ غضبی متعلق ہے ۔ اس کو نفسِ سبعی بھی کہتے ہیں ۔ اس سے روحِ حیوانی متعلق ہے ۔ شرائین اس سے روح حاصل کرتے ہیں ۔ جو محلِ حیاتِ ظاہری ہے کبد یا جگر یا کلیجہ سے قوتِ شہوی متعلق ہے ۔ اس کو لطیفہ نفس اور نفسِ بہیمی بھی کہتے ہیں ۔ اس سے بذریعۂ ارادہ تمام جسم میں خون تقسیم ہوتا ہے ۔ دماغ ۔ اس سے قوتِ تعقل متعلق ہے ۔ اس کو لطیفہ روح اور نفسِ ملکی کہتے ہیں ۔ اعصاب اس سے نکل کر تمام جسم میں پھیلتے ہیں جس سے حِس وادراک ہوتا ہے ۔

انسان کا فرض ہے کہ ہر ایک قوت کو تحتِ قہرمانِ شرعِ متین رکھے۔ نہ آگے بڑھنے دے۔ نہ پیچھے ہٹنے دے۔ قوتِ قلبی کی زیادت سے تہور۔ ظلم پیدا ہوتا ہے۔ کمی سے جبن۔ بزدلی کم ہمتی۔ بے حیائی۔ اعتدال سے شجاعت۔ عزت۔ ہمت۔ غلبہ جوئی پیدا ہوتی ہے۔ قوتِ شہوی کی زیادتی سے شرہ۔ حرص۔ عیش پرستی۔ تن آسانی پیدا ہوتی ہے۔ کمی کے خمود۔ جمود۔ اعتدال سے عفت۔ پاکدامنی پیدا ہوتی ہے۔ قوتِ عقلی کی زیادتی سے گُربزی۔ مکاری۔ فریب پیدا ہوتا ہے۔ کمی سے بلاہت۔ بےوقوفی۔ جہل۔ اعتدال سے حکمت۔ حسن سیاست۔ کمال تدبر ہوتا ہے۔

جب قوتیں تحتِ قہرمانِ شرع ہو جاتی اور شرع نے ان کو جو حصہ دیا ہے اس پر راضی ہو جاتی ہیں۔ تو گویا وہ فنا ہو گئیں۔ ان کا وجود بذاتہ و مستقل نہ رہا بلکہ تحت الشرع و بالشرع رہا۔ جب یہ قوتیں للہ بالشرع کام کرنے لگتی ہیں۔ تو ایک نیا ہی رنگ لیتی ہیں۔ اور ہر ایک قوت ایک جدا نام سے موسوم ہوتی ہے۔ قلب یا غضب سِر بن جاتا ہے۔ نفس یا شہوت خفی بن جاتا ہے۔ عقل و ادراک اخفی محل عرفاں۔ غرض کہ ہزار شکلیں بدلیں۔ مختلف رنگ بدلے مگر ہے وہی غضب و شہوت و عقل۔ البتہ پہلے سے زیادہ لطیف ہو گئے ہیں۔ پہلے لوگوں کو قتل و غارت کرتے تھے۔ اب دوسروں پر اثر ڈالتے ہیں۔ توجہ کرتے ہیں۔ پہلے زناکاری تھی۔ اب حسن پرستی ہے۔ پہلے لوگوں کے گھروں میں گھستے تھے اب دلوں میں گھستے ہیں۔ دلو

خطرات پر اشراف حاصل کرتے ہیں۔ پہلے عقل سے خواص ماہیات وارتباطِ باہمی اشیاء دریافت کئے جاتے تھے۔ اب عقل مہذب ہوگئی ہے تو حقائقِ اشیاء و نسب و اضافات سے بحث ہے۔

لطائف بارزہ کا کمال یہ تھا کہ وہ تحت فرمان شرع کردئے جاتے تھے۔ اب لطائف خفیہ کا کمال یہ ہے کہ تحتِ امرِ الٰہی کردیئے جائیں۔ وہاں اصلاح سے حرکت اللہ کردی جاتی تھی یہاں باللہ، للہ، فی اللہ، الی اللہ، مع اللہ۔ کردی جائے۔ لطائف ستہ کی تہذیب کروگے تو انسان سے انسانِ کامل ہوگے۔ تمہارا نفس، نفس مطمئنہ ہوجائے گا۔

حضرت مولانا جامی و مولانا شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی کے اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان روح مجرد اور مادے کے مجموعے کا نام ہے جسم کی خواہشات واقتضاءات قوی ہوتے ہیں۔ تو نفس کہلاتا ہے روح و نفس دونوں کے اقتضاءات برابر ہوتے ہیں تو قلب روح اپنے مقتضیات میں قوی رہتی ہے۔ تو روح کے نام سے موسوم ہوتی ہے۔ روح ذکرو یادِ الٰہی میں دو جہاں سے التفات توڑکر اور سب سے منہ موڑکر ذاتِ حقہ کی طرف متوجہ ہوجاتی ہے۔ تو یہ سر ہے۔ اس کی یاد میں خود اپنی طرف تک التفات نہیں کرتی تو یہ خفی ہے۔ اور اگر ذاکر و ذکر دونوں درمیان سے اٹھ جائیں اور مذکور ہی مذکور رہ جائے۔ تو یہ اخفیٰ ہے ؎

رباعیات مولانا جامی علیہ الرحمۃ

اے دل! طلبِ کمال در مدرسہ چند — تکمیلِ اصول و حکمت و ہندسہ چند
ہر فکر کہ جز ذکرِ خدا وسوسہ است — شرمے زِ خدا بدار ایں وسوسہ چند

(جامی علیہ الرحمہ)

یارب برہانیم ز حرماں چہ شود — راہے دہیم بکوئے عرفاں چہ شود
بس گبر کہ از کرم مسلماں کردی — یک گبر دگر کنی مسلماں چہ شود

(جامی علیہ الرحمۃ)

ز آمیزشِ جان و تن توئی مقصودم — در مردن و زیستن توئی مقصودم
تو دیر بزی کہ من برفتم ز میاں — گر من گویم ز من توئی مقصودم

(جامی علیہ الرحمۃ)

اے در تو نہاں ہا و عیاں ہا ہمہ ہیچ — پندار و یقیں ہا و گماں ہا ہمہ ہیچ
از ذاتِ تو مطلقاً نشاں نتواں داد — کانجا کہ توئی بود نشاں ہا ہمہ ہیچ

(جامی علیہ الرحمہ)

تمت المعارف حصہ اول

مورخہ ۲ر شوال ۱۳۵۴ ہجری

فہرست تصنیفات

مولانا محمد عبد القدیر صاحب صدیقی وظیفہ یاب صدر شعبۂ دینیات کلیۂ جامعۂ عثمانیہ

الدین (بزبان عربی) اسمیں چار کتابیں ہیں کتاب العلم اصول حدیث میں کتاب الایمان عقائد اہل سنت میں کتاب الاسلام نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ کے بیان میں۔ مذہب احناف کا ماخذ کلام اللہ اور حدیث صحیح سے کتاب الاحسان تصوف و سلوک کا ماخذ قرآن و حدیث سے یہ کتاب دو قسم کے کاغذ پر چھپی ہے۔

رٹ پیپر (۶۰) پونڈ کی قیمت (عـه ۸ر) اور کھرّسے کاغذ کی قیمت (عـه)۔

حکمت اسلامیہ (بزبان اُردو) تصوف و کلام و فلسفہ کی جان یہ عجیب و غریب کتاب جسمیں بڑے بڑے مشکل مسائل کا حل ہے قیمت ۱۰؍۱ر

تبصرۃ الکون (بزبان اردو) ایک مختصر مگر جامع تصوف کا رسالہ ۔ ۔ ۔ ۔ قیمت (۳ر)

اربعین (بزبان عربی) حضرت شاہ ولی اللہ مرحوم بروایت مولٰنائے ممدوح ۔۔ قیمت ۱۰؍ر

تحفۂ اطفال (بزبان اُردو) بچوں کے لئے مذہبی اخلاقی نظم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ قیمت ۱ر

مرآۃ الحقائق عرف تحفۂ فقیر (بزبان اردو) تصوف و مذہب کا خلاصہ دلکش نظم میں ۔ ۔ ۔ قیمت ۲ر

یم عرفان اُردو غزلوں کا مجموعہ۔ پوری کتاب معارف سے پُر ہے قیمت درجۂ اول (۱۰ر) درجۂ دوم (۸ر)

زمزمۂ محبت ۔ یعنے نعتیہ اشعار کا بہترین مجموعہ ۔ ۔ ۔ قیمت درجۂ اول (۴ر) درجۂ دوم (۳ر)

زفرات الاشواق ۔ دیوان عربی معہ کلام فارسی ۔ ۔ ۔ قیمت درجۂ اول (۵ر) درجۂ دوم (۴ر)

معیار الکلام ۔ علم مناظرہ۔ اصول حدیث۔ اصول شہادت اسلام۔ اصول قانون شہادت۔ اصول تاویل۔ اصول فقہ کلیات فقہ و کلیات و اصول قانون متعلق قدیم و جدید طبعی طریقہ پر ترتیب دئے گئے ہیں۔ اس جامعیت اور اس ترتیب کی کتاب اب تک تصنیف نہیں کی گئی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ قیمت (عـه)

اعجاز القرآن - وجوہ اعجاز القرآن و تفسیر سورۂ کوثر پر مولانا کا جامعہ عثمانیہ کی طرف سے منعقد
غلبہ ایکسٹینشن لکچر - - - - - - - - - قیمت (۲)
التعلیم الطبعی (بزبان عربی) یہ رسالہ ڈائرکٹ میتھڈ یا تعلیم طبعی کے اصول پر مبنی ہے اسکی مدد سے
کمسن بچہ بھی بہت جلد عربی بولنے لگتا ہے - - - - - - - قیمت (۴)
المعارف - حصہ اول - تصوف و فلسفہ پر مولانا کے مقالات و ارشادات کا مجموعہ قیمت (۴)

حصہ دوم زیر طبع ہے۔
فصوص الحکم (مع ترجمہ و شرح) - حضرت شیخ محی الدین ابن العربی کی مشہور و معروف اور معرکۃ الآرا
تصنیف ہے۔ فصوص الحکم کا بے نظیر اردو ترجمہ اور شرح کی گئی ہے جس میں تمام دقیق و اہم مسائل کو
فاضلانہ پیرایہ اور جامع انداز میں حل کیا گیا ہے۔ زیر طبع۔

ملنے کے پتے

(۱) حسین شجاع الدین صدیقی محلہ رکاب گنج مولانا مدظلہ، مکان نمبر (۴۴۴)۔
(۲) مکتبہ ابراہیمیہ - عابد روڈ - حیدرآباد دکن۔
(۳) سید عبدالقادر صاحب تاجر کتب چارمینار - حیدرآباد دکن۔
(۴) مولوی ریاست علی صاحب شمس الاسلام پریس چھتہ بازار - حیدرآباد دکن۔

المشتہر

محمد مظہر الدین صدیقی قادری متوطن پربھنی